اقبال کے زرعی افکار

چودھری مظفر حسین

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

اقبال کے زرعی افکار

چودھری مظفر حسین

اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : اقبال اکادمی پاکستان
۱۱۶ - میکلوڈ روڈ ، لاہور

طابع : میاں محمد یعقوب

مطبع : حمایت اسلام پریس ریلوے روڈ لاہور

نگران طباعت : فرخ دانیال

طبع اوّل : نومبر ۱۹۸۴ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۲۰ روپے

ۂ فکرِ اقبال

تغیر و طاقت

فہرست

پیش لفظ	i
دیباچہ	۷
باب اوّل ۔ زراعت سے اقبال کی دلچسپی	۱
دہقان ــــ تصویرِ مظلومیت	۲
ترقیٔ دیہات کی تجاویز	۶
باب دوم ۔ مسئلۂ ملکیتِ زمین	۸
معیشت اور اخلاق کا رشتہ	۱۰
زرعی لگان اور اقبال کا نقطۂ نظر	۱۱
حقِ انتقاع بقدرِ محنت	۱۲
تصوّرِ زمین پیوندی کا تدارک	۱۶
اسلام اور مسئلہ حقوق و فرائض	۲۲
ملکیتِ زمین کے تین اصول	۲۳
باب سوم ۔ زمین بطور متاع اور امانت	۲۵
ملکیت اور متاع کا بنیادی فرق	۲۶
اسلامی فقہ اور زمینی حد بندی	۲۷
تصوّرِ متاع کا شجرِ طیّبہ	۲۸

وطنیت کی اساس ۲۹

قرآن حکیم کی دو مثالیں ۳۰

زرعی نظام کی تنظیمِ نو ۳۱

تنظیمِ نو کے لیے لائحہ عمل ۳۲

دورِ حاضر میں اقتصادی ترقی کا معیار ۳۵

زراعت اور صنعت کا رشتہ ۳۵

باب چہارم - جدید زرعی مسائل پر علامہ اقبال کے نظریات کا اطلاق ۳۷

صنعتی زراعت کے اثرات ۳۸

ایک تصویر کے دو رُخ ۴۱

ہمارے زرعی مسائل ۴۳

اسلام اور متاع کا حرکی تصوّر ۴۷

دوگونہ مشکلات ۵۲

تصوّرِ ملکیت اور متاع کا فرق ۵۲

باب پنجم - کھیت ــــ خودی کی تربیت گہ ۵۵

اقتصادیات اور اخلاقیات ۵۶

نصب العین کا تعین ۵۷

حفظ و نشرِ توحید ۵۸

حفظ خودی ۵۸

روحانی اساس کی ضرورت ۶۴

باب ششم - فکرِ اقبال کی اہمیت ۷۱

باب ہفتم ۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع ۷۹

فلسفۂ تغیر و طاقت ۸۰

مسئلۂ ناداری و غربت ۸۲

توسیع اور اقبال کے فلسفۂ تعلیم کا باہمی تعلق ۸۳

انسان بحیثیت مظہر ارادہ ۸۷

عملی رویّہ ۹۱

توسیع میں فلسفۂ اقبال بطور دلیلِ راہ ۹۴

حوالہ جات و حواشی ۹۷

انتساب

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی ایک تعلیم کردہ دعا کے مطابق منصبِ امامت کی آرزو سے بھی پہلے ازواج اور ذرّیت کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک کی دعا مانگنی چاہئیے جس میں شاید یہ سبق بھی پوشیدہ ہے کہ گھریلو امن و سکون کے بغیر کوئی اہم کام انجام دینا ممکن نہیں۔

اس لئے بطور اظہارِ تشکر

میں اس کتاب کو اپنی رفیقۂ حیات **ثروّت** اور اپنی بیٹیوں **سعیدہ** اور **طیّبہ** کے نام منسوب کرتا ہوں کیونکہ وہ اپنے انتہائی ضروری کاموں کے لیے بھی میری علمی مصروفیات میں کبھی مخل نہیں ہوئیں اور نہ ہی کبھی اس بات کا گلہ کیا ہے کہ میری اس قسم کی مصروفیات سے انہیں کچھ حاصل نہیں۔

پیش لفظ

کوئی بھی قوم جو کسی نظریۂ حیات میں یقین رکھتی ہو اسے اس بات کا لازماً اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ وہ قومی زندگی کے ہر شعبے کو اپنے نظریۂ حیات کے تحت منظم و منضبط کرے لیکن یہ حقیقت کس قدر افسوس ناک ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات کے علمبردار ہونے کے باوجود ہم نے مختلف شعبہ ہائے حیات کے نظریاتی پہلو کو سرے سے ہی فراموش کئے رکھا اور اس پہلو سے اس پر غور و فکر کی کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس کی ۔

علامہ اقبال اس صدی کے پہلے مفکر تھے جنہوں نے اسلام کو ایک نظریۂ حیات کے طور پر پیش کیا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اسلامی نظریۂ حیات کی روشنی میں غور و خوض کیا ۔ اسی اعتبار سے اس ملک کی زراعت پیشہ آبادی کی زندگی کے مسائل بھی ان کے افکار کا موضوع قرار پائے ۔ انہوں نے کسان کی غربت و افلاس ، مسئلۂ ملکیت اراضی ، کسان کی شخصیت پر پیشہ زراعت کے اثرات ، سائنسی اندازِ فکر کو اپنانے کی تحریک جیسے مسائل پر اپنے افکار کو شاعری کی دلکش زبان اور پُر تاثیر اسلوب میں پیش کیا ۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ اقبالیات کا کوئی سکالر اس موضوع پر قلم اُٹھاتا اور علامہ اقبال کے زرعی افکار کو عام فہم زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ۔

مجھے خوشی ہے کہ مظفر حسین صاحب نے اس ضرورت کو پورا کرنے پر توجہ دی ہے ۔ میں مصنف کو بیس بائیس سال سے جانتا ہوں ۔ میرا ان سے تعارف محکمہ زراعت کے مجلہ ''زراعت نامہ''

کے ذریعے ہوا جس میں انہوں نے ''بصائر'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین جاری کر رکھا تھا ۔ قرآن پاک کے حوالے سے زراعت کے موضوع پر ان کی یہ تحریریں میرے لیے دلچسپی کا باعث بنیں ۔ میں اس زمانے میں زرعی یونیورسٹی لائل پور (فیصل آباد) کا وائس چانسلر تھا ، جلد ہی ان سے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے جو آج تک قائم ہیں ۔ اس طویل مدت کے دوران کسی نہ کسی شکل میں ان سے سرکاری رابطہ بھی رہا ۔ محکمہ زراعت کی ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے پہلے اعزازی سیکریٹری اور گزشتہ کئی سال سے اعزازی ایکڈیمک ڈائریکٹر چلے آ رہے ہیں ، اس ناطے سے میرا بحیثیت سیکریٹری محکمہ تعلیم صوبہ مغربی پاکستان اور بعد ازاں سیکریٹری تعلیم حکومت پنجاب ان سے قریبی رابطہ رہا ۔ رسالہ ''اسلامک ایجوکیشن'' جس کے وہ ایڈیٹر تھے، باقاعدگی سے میرے زیر مطالعہ رہا اور میں نے ہمیشہ ان کی تحریروں میں جدّت اور تازگی پائی ۔ اس رسالے میں ان کی بعض شائع شدہ تحریروں کی بین الاقوامی سطح پر بھی قدر افزائی ہو چکی ہے ۔ تھوڑے سے عرصے کے لیے پاکستان زرعی تحقیقاتی کونسل میں انہوں نے براہِ راست بھی میرے ساتھ کام کیا ہے اور پاکستان سائنس فاؤنڈیشن اور نیشنل سائنس کونسل جن کا میں چیئرمین تھا ، مصنف ان اداروں کی بعض کمیٹیوں کے ممبر بھی رہے ہیں ۔ اس مختلف النوع رفاقت کی بناء پر مجھے ان کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہونے کا بھرپور موقع ملا اور اسی واقفیت کی بناء پر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اس قسم کے موضوعات پر کام کرنے کی وہ پوری اہلیت رکھتے ہیں ۔ ابھی پچھلے ہی سال انہوں نے ''تہذیبِ اسلامی کے تناظر میں زرعی توسیع'' کے عنوان سے انگریزی زبان میں ایک وقیع کتاب تصنیف کی جو نیشنل سائنس کونسل پاکستان نے شائع کی ہے ۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ۔

کتاب زیرِ نظر جو زرعی موضوعات پر علامہ اقبال کے نظریات کی توضیح و تشریح کے لیے لکھی گئی ہے، اس اعتبار سے بڑی افادیت کی حامل ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے افکار کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے کہ دورِ حاضر کے زرعی مسائل پر ان سے کیا رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مصنف نے بڑے دلنشیں انداز میں موجودہ دور کے اُلجھے ہوئے زرعی مسائل کا حل تلاش کرنے میں فکرِ اقبال کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔ افکارِ اقبال پر اطلاقی تحقیق کا یہ ایک اچھوتا اور عمدہ نمونہ ہے۔

مصنف کی تحریروں کا بنیادی موضوع معاشی سرگرمیوں کے لیے روحانی اور اخلاقی محرکات کی اہمیت کی وضاحت ہے۔ علامہ اقبال کے نظریات کی وضاحت میں بھی یہی خیال بار بار اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ مغربی تہذیب میں معاشیات کو اخلاقیات سے الگ تھلگ کرنے کا رجحان غالب رہا ہے تاہم وہاں بھی اب ایسے ماہرینِ معاشیات موجود ہیں جو بار بار معاشیات اور اخلاقیات کے رشتے پر زور دیتے ہیں۔ فاضل مصنف نے علامہ اقبال کی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' کے حوالے سے بتایا ہے کہ وہ معاشیات کو اخلاقیات کے تابع رکھنے پر کس قدر زور دیتے ہیں۔ وہ کسان کے زمینی رشتے کو ''متاع'' کے اخلاقی مضمرات کے حوالے سے واضح کرتے ہیں اور اسے تلقین کرتے ہیں کہ کھیتی باڑی کے کام کو وہ اپنی خودی کی تربیت اور نشو و نما کا ذریعہ بنائے۔ فاضل مصنف کی کتاب کا یہ باب جسے انہوں نے ''کھیت۔ خودی کی تربیت گاہ'' کا عنوان دیا ہے، خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اسی طرح زرعی اصلاحات کے ضمن میں تصوّرِ متاع کی اہمیت کا حصہ بھی بہت فکر انگیز ہے۔

زراعت میں محض اقتصادی مطمحِ نظر کبھی بھی صحیح معنوں میں مثبت نتائج نہیں پیدا کر سکتا۔ اس پس منظر میں مصنف کی یہ

کاوشیں قابلِ قدر ہیں کہ وہ زراعت کے پیشہ میں روحانی اور اخلاقی محرکات پر تحقیقی کام کو مسلسل جاری رکھے ہوئے ہیں اور علامہ اقبال کے زرعی افکار پر ان کی موجودہ تصنیف بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے ۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف علمی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھی جائے گی ۔ میں اس کتاب کو اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ سمجھتا ہوں ۔

۶ جون ۱۹۸۴

ظفر علی ہاشمی

پروفیسر ایمریطس زرعی یونیورسٹی

فیصل آباد

دیباچہ

آج سے چودہ پندرہ سال پیشتر جب میں نے اپنے چند دوستوں سے یہ ذکر کیا کہ میں علامہ اقبال کے زرعی نظریات پر ایک مقالہ لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو مجھے بلا استثنٰی ہر ایک کی جانب سے ایک خندۂ استہزا کی صورت میں جواب ملا ۔ مجھے اس غیر متوقع ردِ عمل پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ۔ حیرت اس بات پر تھی کہ ہمارے ماہرینِ اقبالیات بھی کلامِ اقبال کا مطالعہ اس قدر سرسری طور پر کرتے ہیں کہ ایسے موضوعات ان کے نزدیک سرے سے لائقِ التفات ہی نہیں ہوتے اور افسوس اس بات کا ہوا کہ زندگی کے عملی مسائل کے بارے میں جو رہنمائی علامہ اقبال کے افکار سے مل سکتی ہے اس سے ہم کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے ۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کا موضوع مجھے اس لئے سوجھا کہ میں نے اپنی ملازمت کا سارا عرصہ محکمہ زراعت میں گزارا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی تو انکار ممکن نہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری میں دہقان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے اور بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں انہوں نے زمینداروں اور کاشت کاروں سے براہ راست خطاب کر کے انہیں اپنا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے ۔ کیا یہ حقائق اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ ہم زرعی موضوعات پر ان کے خیالات سے واقف ہونے کی کوشش کریں ؟

اس میں شک نہیں کہ زراعت ایک معاشی معاملہ ہے لیکن علامہ اقبال انسان کے معاشی معاملات کو اخلاقی نقطۂ نظر سے

دیکھتے ہیں اور ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اسلام سے ماخوذ ہے جس کی بنیاد ایمانیات (چند ما بعد الطبیعیاتی تصورات) پر قائم ہے - مثلاً یہ کائنات اللہ تعالٰی کی تخلیق ہے - تخلیق ہونے کے ناطے سے پوری مخلوقات خدا کا کنبہ ہے جس کی کفالت کے لیے اللہ تعالٰی نے ایک آفاقی نظامِ رزق رسانی قائم کر رکھا ہے - انسان کی حیثیت اس کائنات میں پائے جانے وسائلِ رزق کے امین کی ہے اور دہقان اس عالمگیر نظامِ رزق رسانی کے ظاہری اسباب میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے - اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق یہ کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے لیکن خود انسان کو اللہ تعالٰی کی عبادت اور آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے - کسان کا پیشہ اگرچہ خاکبازی ہے لیکن اسے زمین پیوستگی کی بجائے زمین وارستگی کا مطمح نظر اپنانا چاہیے ، زمین کو ملکیت کی بجائے متاع سمجھنا چاہیے اور کسی بھی صورت میں اپنی خودی کی پرورش اور تربیت سے غافل نہیں ہونا چاہیے - علامہ اقبال کے یہ نظریات نہ صرف کاشتکار کی نفسیات میں ایک روحانی انقلاب لانے کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان نظریات کی روشنی میں ہمیں اپنی زرعی پالیسی ، قومی تعمیر اور ملکی سیاست میں دیہی آبادی کے کردار کا رُخ متعین کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے -

غرض علامہ اقبال کے زرعی افکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ زراعت کے پیشہ کے لیے اخلاقی اور روحانی محرکات کا کام دیتے ہیں - معاشی جد و جہد میں روحانی اور اخلاقی محرکات کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وضاحت کے لئے یہاں ایک مثال کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا - امریکی کسان دنیا بھر میں اپنی مہارت اور کارکردگی کے لئے مشہور ہیں - زرعی کاروبار میں ان کی کارکردگی کا جواب نہیں - چنانچہ عام تاثر یہی ہے کہ ان سے زیادہ خوشحال کسان دنیا بھر میں کہیں اور نہیں پائے جاتے لیکن حال ہی میں

ورلڈ واچ انسٹیٹیوٹ کے حوالے سے روزنامہ ''ڈان'' لاہور (مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ء) میں امریکی کاشت کار کی حالت زار کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ عبرت انگیز ہے۔ اس مضمون میں لیسٹر آر۔ براؤن (Lester R. Brown) نے بتایا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں امریکہ کے کاشت کار ۲۱۵ بلین ڈالر کے مقروض ہیں اور ان کے ذمہ قرض کی یہ رقم برازیل، میکسیکو اور ارجنٹائن کے ممالک کے مجموعی غیر ملکی قرض کے برابر ہے اور اگر امریکی کاشت کار اپنے ذمہ اس قرض کا فقط سود ہی ادا کرنا چاہیں تو ۱۹۸۴ء میں گندم کی کل پیداوار، سویابین کی کل پیداوار اور مکئی کی پیداوار کی کچھ پیداوار کی مجموعی مالیت سے یہ قرض چکایا جا سکتا ہے۔ اس بھاری قرضے کے بوجھ تلے وہاں کا کاشت کار اس بات پر مجبور ہے کہ وہ محض زیادہ پیداوار لینے کی خاطر ایسے کاشتی طریقے اختیار کرے جو تحفظ اراضیات (Soil Conservation) کے اصولوں کے سراسر منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں زمین بردگی (Soil Erosion.) میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ملک و قوم اور امریکی تہذیب کی بقا خطرے میں پڑ گئی ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال وہاں کے مفکرین کے لیے سخت تشویش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ ذرا بھی تعمق فکر سے کام لیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ یہ صورت حال درحقیقت غلط نظریۂ حیات کے وہ مہلک اثرات ہیں جو وہاں کی زراعت پر مرتب ہو رہے ہیں۔ عیش کوشانہ تمدن (Sensate Culture)، دنیاداری اور آخرت فراموشی (This Worldless) اور فلسفۂ صرف (Philosophy of Consumerism) کے نتیجے میں وہاں کا کاشتکار اس قسم کے المیہ سے دوچار نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اگر ہم اپنے کسان بھائیوں کو اس قسم کے المیہ سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ کوشش کرنی ہوگی کہ اپنے کاشت کار بھائیوں کے سامنے ان کے پیشے کے حوالے سے اسلامی نظریۂ حیات رکھیں۔ علامہ اقبال اس دور کے سب سے بڑے شارح اسلام ہیں

اور خوش قسمتی سے انہوں نے زراعت کے حوالے سے بھی اسلامی نظریۂ حیات کی تشریح کی ہے ۔ مقالہ زیر نظر میں علامہ اقبال کی اس کوشش کا اطلاقی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا اور اقبال کے زرعی افکار کی توضیحات پیش کی گئی ہیں ۔

یہ مقالہ آج سے بارہ سال پہلے مکمل کر لیا گیا تھا ۔ اس کے کچھ حصے بعض جرائد میں شائع بھی ہو چکے ہیں لیکن مکمل کتابی صورت میں اس کی اشاعت معرض التوا میں رہی ۔ آخر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے تقاضے پر آج سے ڈیڑھ دو سال قبل یہ مسوّدہ ان کے حوالے کیا گیا جسے اب اقبال اکادمی شائع کر رہی ہے ۔ میں جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب اور جناب پروفیسر محمد منوّر صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مقالہ کی اشاعت میں دلچسپی لی اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہونے کی نوبت آئی ۔

مظفر حسین

باب اوّل

زراعت سے اقبال کی دلچسپی

انسانی تاریخ کے اولیّن ادوار سے لے کر آج تک زراعت کو ایک بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کی بقا کا انحصار ہی زراعت پر ہے۔ کرّۂ ارض پر جتنی تہذیبیں بھی پروان چڑھیں ان سب کے پیچھے زراعت کی پشت پناہی کارفرما رہی اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ اس کا گہرا تعلق رہا۔ علامہ اقبال اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''ما بعد الطبیعاتی فلسفے کا ارتقاء'' میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایران میں زرتشت کے مذہب کی جڑیں زراعت میں استوار تھیں اور یہیں سے اس مذہب کو نشوونما ملی[1]۔ انسانی زندگی میں زراعت کی اہمیت کے پیشِ نظر اقبال زندگی بھر زراعت اور کاشت کار کے حالات کو بہتر بنانے کے مؤید رہے۔ چنانچہ ان کی اولیّن تصنیف ''علم الاقتصاد'' سے لے کر ان کے آخری مجموعۂ کلام ''ارمغانِ حجاز'' تک زراعت اور کاشتکار کے موضوع پر ان کے بے شمار بصیرت افروز خیالات ملتے ہیں۔ پھر چونکہ برّصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کی غالب اکثریت شروع ہی سے زراعت کے پیشے سے وابستہ تھی اس لیے ممکن نہ تھا کہ کوئی مفکّر اس خطے کے لوگوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصلاح کا کوئی خیال یا اس خیال کو عملی جامہ پہنانے سے بالواسطہ طور پر مرتب ہونے والا تہذیبی و ثقافتی اور اخلاقی ترقی کا کوئی

نقشہ زیرِ غور لاتا اور اس میں کاشت کار کے احوال کی اصلاح کو بنیادی اہمیت نہ دی جاتی۔ چنانچہ حکیم الامّت علامہ اقبال کی اسلامیانِ پنجاب کے اکثریتی طبقے کے عملی مسائل سے دلچسپی ایک فطری امر تھی۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے صدارتی خطبہ میں آپ نے کاشتکار آبادی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

''ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا انحصار پنجاب کے مسلمان کاشت کار کی آزادی پر ہے۔ پھر چاہیے کہ آتش شباب سوز یقین کے ساتھ مل کر زندگی کی شعاع کو تیز کرے اور آنے والی نسلوں کے لیے عمل کی نئی زندگی تخلیق کرے''[۲]۔

اس تقریر میں آپ نے تجویز پیش کی کہ نوجوانوں کی ایسی جماعتیں اور رضا کار دستے قائم کیے جائیں جو اپنی تمام کوشش، خدمتِ خلق اور دیہات کی اقتصادی و سماجی اصلاح کے لیے وقف کریں۔ کاشتکاروں سے قرض کا بوجھ اتاریں اور ان کی اقتصادی مشکلات دور کرنے میں مدد دیں اور ساہوکار، آڑھتی اور نام نہاد پیروں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائیں۔

دہقان ـــ تصویرِ مظلومیت

علامہ اقبال کے استاد سید میر حسن کے صاحبزادے سید ذکی شاہ، منظور انور قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے علامہ اقبال کے بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔

''۔۔۔۔۔۔۔ ایک دفعہ ہم تین چار دوست سیر کے لیے شہر سے باہر نکل گئے۔ سڑک کے کنارے ایک بوڑھا کسان ہل چلا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد کھیتوں میں گندم کے سنہری خوشوں کی

مشعلیں سی روشن تھیں ۔ اقبال پھٹے پرانے اور بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس بوڑھے کسان کو ہل چلاتا دیکھ کر وہیں رک گیا ۔ اور اس کے قریب جا کر کہا ''بابا ! گندم کے یہ کھیت کس کے ہیں'' بوڑھے کسان نے جواب دیا ''یہ کھیت میرے ہیں اور ان کے سینے پر لہلہانے والی یہ گندم نہ جانے کس کی ہے ؟'' یہ جواب ہم سب کے لیے حیران کن تھا ۔ اقبال جیسے کوئی بات کریدنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اس نے کسان سے پھر سوال کیا :

''اگر صرف زمین کے یہ ٹکڑے ہی تمہارے ہیں اور ان میں اگنے والی کوئی چیز تمہاری نہیں ہے تو تم اس قدر محنت کیوں کر رہے ہو''۔ بوڑھے نے مُسکرا کر جواب دیا ''اگر تم کسی کسان کے بیٹے ہو تو چند سال ٹھہر جاؤ اس سوال کا جواب تمہیں خود بخود مل جائے گا''[۳]۔

علامہ اقبال کے دل و دماغ پر دہقان کی مظلومیت کا جو نقش اس واقعہ سے بچپن میں ثبت ہو گیا تھا ، وہ تا عمر قائم رہا ۔ کاشتکاروں کی زندگی کے گونا گوں مسائل ہمیشہ علامہ اقبال کی سوچ بچار کا ایک اہم موضوع بنے رہے اور ان مسائل میں آپ کی گہری ذاتی دلچسپی کا یہ عالم رہا کہ آپ کے آخری مجموعہ کلام ''ارمغانِ حجاز'' میں یہ اشعار ملتے ہیں ۔

دہقان ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مُردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جان بھی گرو غیر ، بدن بھی گرو غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے، نہ مکیں ہے[۴]

اقبال کے نزدیک دہقان کی زندگی موت سے بدتر ہے ۔ ''خفتگانِ خاک'' سے ان کا یہ استفسار کہ مرنے کے بعد بھی دہقان

کو چین نصیب ہوتا ہے کہ نہیں؟ دہقان کو غربت و افلاس کی ایک مستقل علامت بنا دیتا ہے۔

اس جہاں میں اک معیشت اور سو اُفتاد ہے
روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے؟

کیا وہاں بجلی بھی ہے! دہقان بھی ہے خرمن بھی ہے؟
قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے؟[۵]

کاشت کار کی معاشی ابتری اور معاشرتی زبوں حالی کا جو نقشہ ان درد انگیز الفاظ میں کھینچا گیا ہے، اس سے کاشتکار کی محکومی و مظلومی پر ان کے دلی کرب کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ اس طرح جب وہ محکوم و مجبور و فقیر کشمیر کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس میں بے دردیٔ ایّام کی داستان سمونا چاہتے ہیں تو اس کے لیے بھی ان کی چشم تصوّر غیر شعوری طور پر کسی دہقان پیر ہی کے غم خانہ پر جا رُکتی ہے۔

سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطانِ امیر
کہہ رہا ہے داستان بے دردی ایّام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر[۶]

عالم بالا میں اپنے خیالی سفر کے دوران میں بھی علامہ اقبال کی نظریں سینۂ ارض کو چیر کر لعل و گہر پیدا کرنے والے دہقان کو ڈھونڈ نکالتی ہیں اور اس کو آسودہ حال دیکھ کر ان کو طمانیت پہنچتی ہے۔ چنانچہ ''جاوید نامہ'' میں مریخ سے شہر مرغدین کی سیر کے بیان میں لکھتے ہیں۔

سخت کش دہقان چراغش روشن است
از نہاب دہ خدایاں ایمن است

کشت و کاوش بے نزاع آب جو است
حاصلش بے شرکت غیرے از دست[۷]

غرض جہاں کہیں بھی کاشتکار کی غربت و افلاس کا ذکر ہے علامہ اقبال انتہائی جذباتی انداز میں اسے بیان کرتے ہیں - جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کاشتکار کی مظلومیت اور مفلوک الحالی سے شدید متاثر تھے اور اس کے ازالہ کے لیے سخت مضطرب اور بے چین - بسا اوقات اس ضمن میں ان کا لب و لہجہ انتہا پسندی کی اس حد تک انقلابی بلکہ باغیانہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے غم و غصّہ کے اظہار کے لیے اس طرح کے تند و تیز اشعار سے کم پر مطمئن نہیں ہو پاتے -

خدا آں ملّتے را سروری داد
کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

بہ آں ملّت سرو کارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت[۸]

حاصل آئین و دستور ملوک دہ خدایان فربہ و دہقان جو دُوک[۹]

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایان کشت دہقاناں خراب

انقلاب انقلاب

اے انقلاب![۱۰]

جس کھیت سے دہقان کو میسّر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو"

ترقیٔ دیہات کی تجاویز

مزارعین کی مظلومیت کے خلاف جہاد میں علامہ اقبال نے محض شعر سے کام لے کر گفتار کا غازی بننے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ۲۸ - ۱۹۲۶ء میں جب وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے تو غریب کاشتکاروں کے مسائل حل کرانے کے لیئے کردار کا غازی ہونے کا ثبوت بھی دیا۔ حکومت پنجاب نے منٹگمری (ساہیوال) میں نیلی بار کی تین لاکھ ستر ہزار ایکڑ اراضی متموّل اور سرمایہ دار لوگوں کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے تحریک پیش کی کہ اس رقبے کا نصف حصّہ مزارعین میں تقسیم کیا جائے۔ اسی طرح ۱۹۲۸ء میں اسمبلی کے اجلاس میں یہ تحریک پیش کی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھے غیر آبپاش زمین ہو اور پیداوار عملاً معین مقدار میں حاصل ہوتی ہو تو اس پر لگان نہ لگایا جائے[۱۲]۔ وہ ترقی دیہات کے ہمیشہ پُر جوش مبلّغ رہے اور دیہات میں زیادہ سے زیادہ طبّی اور حفظانِ صحت کی سہولتیں بہم پہنچانے کی طرف حکومت کی توجہ دلاتے رہے۔ اس قسم کی تجاویز کو آج کل کی سیاسی جماعتیں شاید اپنی ترقی کا ثبوت دینے کے لیے اپنے منشورات میں جگہ دیتی ہیں۔ جب کہ علامہ اقبال نے آج سے قریباً نصف صدی پیشتر ہی اس قسم کی اصلاحات کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ جس جوش و خروش سے انھوں نے اس تحریک کو پیش کیا، اس کا اندازہ اس تقریر کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو پنجاب اسمبلی کے ایوان میں کی گئی۔ اس تقریر میں ایوان کی توجہ اس شدید نا انصافی کی طرف دلائی گئی کہ جہاں کوئی شخص زمین کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے دو ہزار

روپیہ سالانہ آمدنی تک ٹیکس سے مستثنٰی ہے وہاں اس بات کا آخر کیا جواز ہے کہ زمیندار خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اور زمین سے اس کی آمدنی خواہ کتنی ہی کم ہو، اسے لازماً لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ یہ نظام سراسر نا انصافی پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ دلیل یہاں کوئی وقعت نہیں رکھتی کہ اسے ختم کرنے سے مشکلات پیدا ہوں گی لہذا اسے برقرار رکھا جائے۔ اس کے برعکس ہمیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ چونکہ یہ نظام سر سر انصاف کے منافی ہے اس لیے اس کا ازالہ کیا جانا ضروری ہے۔ اس ضمن میں آپ نے دلیل دی کہ اس وقت صوبے میں اقتصادی ملکیت دس ایکڑ شمار ہوتی ہے اور پانچ بیگھے کی حد اقتصادی ملکیت کا نصف ہے۔ اس لیے پانچ بیگھے تک لگان معاف کر دینے سے محاصل میں خاص کمی واقع ہونے کا اندیشہ نہیں۔ ان دلائل کے علاوہ آپ نے یورپین مصنفین بالخصوص پیرون (Peron) اور برگز (Briggs) کے حوالوں سے یہ دلچسپ اور اہم نکتہ بھی اٹھایا کہ ہندوستان کی پوری تاریخ میں کسی بھی حکومت نے زمین کے مالک ہونے کا دعویٰ نہیں کیا[۱۳]۔

باب دوم

مسئلۂ ملکیت زمین

پنجاب میں انگریز کے قائم کردہ نظام جاگیرداری سے علامہ اقبال سخت بیزار تھے۔ ان کے نزدیک یہ نظام پنجاب میں ایک صحت مند معاشی اور معاشرتی ماحول کی تشکیل میں سدِّ راہ بنا ہوا تھا۔ زمین کی پیداوار بڑھانے کے ضمن میں جاگیرداردوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ایک تو پیداوار کم ہو رہی تھی جو روز افزوں آبادی کے پیشِ نظر ایک انسانی جرم تھا۔ دوسری طرف آبادی کا دباؤ اور زمین کا لگان بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی دولت میں ہونے والا اضافہ بالواسطہ مزارعین کے استحصال پر منتج ہوتا تھا اور علامہ اقبال اس صریح ظلم کے خلاف سراپا احتجاج تھے۔ اس نظام جاگیرداری کی وجہ سے مزارعین کی روز افزوں غربت انھیں غیر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہی تھی اور خودی کی نشو و نما کی طرف توجہ دینے کے بجائے وہ ساری زندگی جسم و جاں کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے جتن دیتے تھے۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کی غرض و غایت ہی افراد کی ذاتی خوبیوں کو پروان چڑھانا ہے تو نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ معاشی ترقی کی روکاوٹوں کو محض اسی لیے ہی دور نہیں کرنا چاہتے تھے کہ قوم کی دولت مندی میں اضافہ ہو یا کہ مادی اعتبار سے افرادِ قوم کا معیارِ زندگی بلند ہو بلکہ صرف اور صرف اس

لیے کہ ان کے اندر اعلیٰ و ارفع اخلاقی و روحانی اقدار کے لیے جد و جہد کی امنگ پیدا ہو اور ہر فرد کی خودی ترقی کرے اور یہ کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں محض معاشی مشکلات کی وجہ سے برباد ہو کر نہ رہ جائیں اور ان کی خودی کی نشو و نما رُک نہ جائے۔ غرض معاشی مسائل سے آپ کی تمام دلچسپی اس اخلاقی اور روحانی نصب العین کے تابع تھی جو اسلام کا طرۂ امتیاز ہے نہ کہ قومیانے (Nationalisation) یا اشتراک (Communism) کی غرض سے جس میں ہمہ گیر (Totalitarian) معاشرے میں افراد کی ذاتی صلاحیتوں کو آزادانہ ابھرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملتا۔ ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں علامہ فرماتے ہیں:

''قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دار و مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظّم ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں اور قدرت اور صلاحیت کیا ہے؟ یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظّم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے اجتماعی افکار کی دولت سے تو مالا مال ہو جاتا ہے لیکن اپنی حقیقی روح کھو بیٹھتا ہے''[۱]۔

معیشت اور اخلاق کا رشتہ

اس ارشاد کی روشنی میں زمین کو قومی ملکیت میں لینے کا آخر کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ درحقیقت ایک سچّے مسلمان کی طرح علامہ اقبال کا معاشی طور پر غور کرنے کا انداز بھی یہ تھا کہ اسلام میں معیشت اور اخلاق با ہمد گر مربوط اور ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت ''لن تنالو البّرحتی تنفقوا ممّا تحبّون'' (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس چیز کا انفاق نہ کرو جو تمھیں محبوب ہے) کی تشریح ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے یوں کی ہے کہ فاعل اخلاق کا انفاق

اس کے لیے اخلاقی فضیلت اور انفاق سے مستفید ہونے والے کے حق میں عملِ معیشت ہے۔ اس لیے جب تک اخلاق اور معیشت باہمدگر مربوط نہ ہوں از رُوئے قرآن معاشرے میں اس کا عمل متصوّر نہیں ہوتا۔ اخلاق اور معیشت کا یہ گہرا تعلق پیشِ نظر ہو تو ''کاد الفقر ان یکون کفرا'' کی حدیث کی روشنی میں بقول اقبال اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے اور انسانی روح کے مجلہ آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے''[۲]۔

اس طرح کثرتِ نعمت بھی انسان کے دل کا گداز چھین کر اسے نیاز کے بجائے ناز کا خوگر بنا دیتی ہے۔

اے بسا مرد حق اندیش و بصیر مے شود از کثرت نعمت ضریر
کثرت نعمت گداز از دل برد ناز می آرد نیاز از دل برد

حکومت وقت کا فرض ہے کہ وہ تنظیمِ دولت کے لیے آئینی، قانونی اور تنظیمی طریقے اختیار کرے تا کہ معاشرے کے اندر تقلیل و کثرت دولت کے اخلاقی مفاسد جنم نہ لینے پائیں۔ اس لیے جہاں اسلام کے عادلانہ اور متوازن نظام معیشت کے قیام میں ملکیت کا مسئلہ روکاوٹ پیدا کر رہا ہو وہاں زرعی املاک کی از سرِ نو تنظیم ضروری ہو جاتی ہے۔

زرعی لگان اور اقبال کا نقطۂ نظر

مسئلہ ملکیتِ زمین سے علامہ اقبال کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ ان کی سب سے پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' میں بھی جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس میں وہ زرعی

لگان کے باب میں بعض فلسفیوں کے حوالے سے اس خیال کو پیش کرتے ہیں کہ زمین چونکہ کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ قدرت کا مشترکہ عطیہ ہے ۔ اس لیے اس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حقِ ملکیت حاصل ہے ۔ جاگیرداری کے خلاف انھوں نے اس کتاب میں ایک اور دلیل بھی دی ہے ، جس میں وہ فرماتے ہیں :

''جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ۔ ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے ، جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائشِ آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں اُن کا لگان بڑھ جاتا ہے ۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جا رہے ہیں ، حالانکہ یہ مزید دولت جو انھیں ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ ہی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے ۔ ان کی ذاتی کوشش اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ پھر انھیں کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے ہیں ۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے ۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو کوئی بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی یہ امیری صریحاً اصولِ انصاف کے خلاف ہے''[۳] ۔

حقِ انتفاع بقدرِ محنت

ان کے پورے کلام میں جگہ جگہ اس قسم کے واضح اشارات ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال زمین کو ''ملکیت کے بجائے متاع'' قرار دیتے ہیں ۔ جس سے صرف ایک مختصر مدت کے لیے

انسان کو حقِ انتفاع بقدرِ محنت دیا گیا ہے۔ قرآنی آیت ''الارض للّٰہ'' کے معانی میں وہ بڑی وسعت پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک چونکہ زمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام نوع انسانی کے لیے آب و نان مہیّا کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس لیے وہ اس کی ''امانت'' کی حیثیت پر زور دیتے ہوئے کسی فرد (خواہ وہ مزارع ہو یا مالک) کسی بادشاہ یا کسی حکومت کا زمین پر ایسا حق تسلیم کرنے کے روادار نہیں جو انصاف اور مفاد عامہ کے خلاف ہو، جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز
دونوں یہ کہہ رہے تھے میرا مال ہے زمیں

کہتا تھا وہ کرے جو زراعت اسی کا کھیت
کہتا تھا یہ کہ عقل ٹھکانے تیری نہیں

پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تُو
بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے[۵]

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں میری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں[۶]

حق زمیں را جز متاع مانگفت
ایں متاع بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا نکتہ از من پزیر
رزق وگور ازوے بگیر اورا مگیر[۷]

رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

بندۂ مومن امیں حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی ھالک است

آب و نان ماست از یک مائدہ
دودۂ آدم کنفس واحدہ[۸]

اے کہ می گوئی متاع ما زماست
مرد ناداں ایں ہمہ ملک خدا است

ارض حق را ارض خود دانی بگو
چیست شرح آیہ لاتفسدو

ابن آدم دل بابلیس نہاد
من ز ابلیس ندپدم جز فساد

کس امانت را بکار خود نبرد
اے خوش آن کو ملک حق باحق سپرد[۹]

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمین[۱۰]

اقبال کے ان اشعار سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ وہ زمین کو قومیانے کے حق میں تھے لیکن جیسا کہ ہم پہلے اسمبلی کی تقریر کے حوالے سے یہ بیان کر چکے ہیں ، انھوں نے زمین کے لگان پر بحث کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا تھا کہ زمین حکومت کی ملکیت نہیں ۔ پھر جب وہ فرماتے ہیں کہ ''پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین'' تو اس میں ''پادشاہوں'' کے لفظ کا موجودہ

دور کی حکومتوں پر بھی اطلاق ہوتا ہے ۔ اور اس لفظ کے معنی کو صرف ''جاگیردار'' تک محدود کر دینا مناسب نہیں ؟ چنانچہ جب وہ زمین کی زبان سے یہ کہلواتے ہیں ۔

مالک ہے یا مزارع شوریدہ حال ہے
جو زیرِ آسماں ہے وہ دھرتی کا مال ہے

تو اس میں زمینی ملکیت کے بارے میں مالک اور مزارع دونوں کے دعوی ملکیت کی نفی کر رہے ہیں ۔ یا پھر جب وہ جاگیردار سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

دہ خدایا نکتہ از من پزیر
رزق وگور از وے بگیر او رامگیر

تو اس میں بھی مقصود درحقیقت اخلاقی تزکیہ ہے نہ کہ زمینی ملکیت کے مسئلے کا قانونی محاکمہ اور فیصلہ کیونکہ اس شعر سے متصل یہ اشعار بھی آتے ہیں ۔

صحبتش تا کے تو بود و او نہ بود
تو وجود و او نمود بے وجود

تو عقابی طائف افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطن ''الارض للہ'' ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نبیند کافر است

کس نگویم در گزر از کاخ و کوئے
دولت تست این جہاں رنگ و بوئے

دانہ دانہ گوہر از خاکس بگیر
صید چون شاہین ز افلاکش بگیر''

اور اس سلسلے میں آگے چل کر یہ فرماتے ہیں :

دل برنگ و بوئے و کاخ و کو مدہ
دل حریم اوست جز یا او مدہ[۱۲]

تصورِ زمین پیوندی کا تدارک

ظاہر ہے اگر اس پورے سیاق و سباق کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ جاننے میں ہرگز کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ بات ''ملکیتِ زمین'' کے قانونی پہلوؤں پر نہیں ہو رہی بلکہ زمین کے ساتھ ان غلط ذہنی اور جذباتی رشتوں کی اصلاح مقصود ہے جن کی وجہ سے ''ملکیت'' کا تصور زمین پیوندی (Earth-rootedness) کی صورت میں ''حریم دل'' کے اندر جگہ پا لیتا ہے اور انسان یہ بھول جاتا ہے کہ ''متاع الی حین'' کے مصداق زمین سے اس کا تعلق بالکل عارضی اور نا پائیدار ہے اور جس زمین کو وہ آج اپنا مال سمجھ رہا ہے کل کو خاک میں مل کر خاک ہو جانے پر وہ اس کا مال بن جانے والا ہے ۔ غرض اقبال کا مقصد مسئلہ زمین کے بارے میں قرآن آفاقی نقطہ نظر پیش کرتا ہے تا کہ وہ اپنی خودی کی نشوونما سے غافل نہ ہو ۔ قرآن حکیم زمین کو ''متاع'' قرار دیتا ہے ۔ جس کی رو سے انسان کو اس پر معاشی تصرّف کا حق دیا گیا ہے جو تصورِ ملکیت کی بنیاد ہے ۔ یعنی زمین کی ملکیت کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ تمتع کرنے دیا جائے ۔ کیونکہ قرآن حکیم ''یمنعون الماعون'' کے مصداق اپنی انتہائی نجی ملکیت یعنی گھریلو استعمال کی چیزوں تک سے بھی دوسروں کو تمتع کرنے کی تلقین کرتا ہے[۱۳] ۔ لیکن ہمارے معاشرے میں جاگیردارانہ مفاد پرستی نے زمین کے بارے میں جو ذہنیت پیدا کی ہے اس کی رُو سے ملکیت کا مفہوم جاگیردار کو یہ حق دیتا ہے کہ نہ تمتع کرو نہ تمتع کرنے دو جو کہ سراسر اسلام کے خلاف ہے ۔ حضرت عمرؓ نے بلالؓ بن حارث المزنی سے خود رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی بخشی ہوئی جاگیر بھی، جسے وہ کاشت نہیں کرتے تھے [۱۳]، ملّی مفاد کی خاطر چھین لی تھی اور ان کے پاس صرف اتنا حصہ رہنے دیا جسے وہ خود کاشت کی قدرت رکھتے تھے۔ نجات اللہ صدیقی ''اسلام کا نظریۂ ملکیت'' میں رقم طراز ہیں۔

''حقوق فرائض کی خاطر دیئے گئے ہیں اور انھی پر مبنی ہیں۔ حقوق کی نوعیت اور ان کے حدود متعلقہ فرائض کی نوعیت اور ان کے حدود سے متعیّن ہوتے ہیں۔ اصل زور فرض پر دیا گیا ہے۔ حق کی اہمیت اس کے تحت آتی ہے۔ دنیا میں انسان کی اصل حیثیت ایک ''مکلف'' یا ذمہ دار ہستی کی ہے نہ کہ ''حقدار'' کی۔ معاصر مغربی تہذیب نے حقوق و فرائض کی یہ فطری ترتیب بالکل الٹ دی ہے اور ایک ایسا مزاج بنا دیا ہے جو سماجی فکر کا آغاز فرد کے حقوق سے کرتا ہے نہ کہ اس کی ذمہ داریوں سے''[۱۵]۔

آگے چل کر صدیقی صاحب فرائض اور حقوق کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں۔

''اسلام انفرادی حقوق کی کسی مطلق اور مقدس فہرست کا قائل نہیں۔ حقوق کسی کے بھی ہوں، فرد کے یا ریاست کے غیر مشروط مطلق اور مقدس نہیں ہوتے۔ ان کی نوعیت اور وسعت کا انحصار تمام تر ان ذمہ داریوں پر ہوتا ہے جن کی انجام دہی کے لیے وہ دیئے گئے ہوں''[۱۶]۔

چنانچہ حقِ ملکیت کے بارے میں صدیقی صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے۔

''پہلی بات یہ ہے کہ فرد، ریاست اور اجتماع تینوں کے اعمال و وظائف اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انھیں مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی حقوقِ ملکیت سے یکسر

محروم کر دیا گیا تو وہ ان ذرائع اور وسائل سے محروم رہ جائے گا جو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے درکار ہیں''[۱۷]۔

سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور'' کے اندر ۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو مسئلہ ملکیت زمین پر ہونے والی ایک گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ۔

''قدرے سکوت کے بعد کہنے لگے ۔ اب حالات بدل گئے ہیں ۔ پرانے خیالات کی جگہ نئے خیالات نے لے لی ہے اور دنیا میں ایک ایسا نظام بھی قائم ہے جو زمین پر افراد کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں کرتا ۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ اسلام کا قانونِ وراثت بڑا خوب خوب ہے ۔ اس کی غائت ہے دولت کی تقسیم در تقسیم تا کہ زر اندوزی کی نوبت نہ آئے ، نہ اجارہ داری کی ، نہ جاگیریں ہوں ، نہ زمیندار اور کاشت کار کا باہمی نزاع ۔ یوں نظام سرمایہ داری پر بھی کڑی ضرب لگتی ہے ۔ رہی زمین سو اللہ کا مال ہے ۔ اس پر کسی کو حقِ ملکیت نہیں ''[۱۸]۔

اس اقتباس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ علامہ اقبال زمین کو روسی اشتراکیت کی طرز پر قومیانے کے حق میں تھے ۔ لیکن اس سے ذرا پہلے کی گفتگو کا یہ حصہ خاص طور پر قابلِ غور ہے ۔ ''ارشاد ہوا ۔ دراصل ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے فقہاء نے زمین کے مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کا بہ تحقیق مطالعہ کیا جائے ۔ پھر ماہرینِ فن موجودہ حالات کی رعایت سے اس مسئلے پر غور کریں ۔ زمین کی حیثیت بہرحال یہ نہیں کہ ہم اس پر عام اشیائے استعمال کی طرح حق ملکیت تسلیم کریں''[۱۹]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک اسلامی حکومت وقت کے تقاضوں کے مطابق زرعی نظام میں ضروری تغیرات اور

اصلاحات کی مجاز ہے جس کے لیے وہ زمین کے مسئلے پر فقہی لٹریچر اور جدید ماہرینِ فن کی آراء کی روشنی میں اجتہاد ضروری خیال کیا کرتے تھے ۔

''انوارِ اقبال'' میں علامہ اقبال کا خواجہ عبدالرحیم کے نام ایک ایک خط موجود ہے ۔ اس خط میں علامہ صاحب فرماتے ہیں ۔

''اسلام کے نزدیک زمین وغیرہ امانت ہے ۔ ملکیت مطلقہ جس کو قدیم و جدید قانون تسلیم کرتے ہیں ۔ میری ناقص رائے میں اسلام نہیں'' ۔

فقہاء میں بہت سا اختلاف ہے ۔ ۔ ۔ ۔ زمین کے متعلق تھوڑی سی بحث اشارۃً جاوید نامہ میں بھی ہے جو زیر طبع ہے''[۲۰] ۔

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے ۔ ''والارض کلہا فی الحقیقۃ بمنزلۃ مسجد او رباط جعل و قفا علی ابناء السبیل وھم شرکاء فیہ''[۲۱] ۔

''خدا کی یہ ساری زمین سب انسانوں کے لیے ایک مسجد اور سرائے کی طرح وقف ہے ۔ جس طرح ایک وقف میں سب مسافروں کو فائدہ اُٹھانے کا پورا پورا حق ہوتا ہے اسی طرح سب لوگ خدا کے اس وقف سے فائدہ اُٹھانے میں برابر کے شریک ہیں'' ۔

غرض علامہ اقبال کا خیال یہ تھا کہ جب اسلام کو ایک عوامی تحریک کی حیثیت حاصل ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں اسلام ایک سیاسی اجتماعی نظام مدنیت کی صورت میں معرضِ وجود میں آ جائے گا تو ان مسائل کے حل کی صورتیں خود بخود نکل آئیں گی ۔ روس کی اشتراکی حکومت کی تقلید میں اور اشتراکی معنوں میں زمین کا قومیانا ان کے پیشِ نظر ہرگز نہیں تھا ۔

سید نذیر نیازی نے سیالکوٹ میں یوم اقبال کے سلسلے میں اسلام کے معاشی نظامِ پر علامہ اقبال کے خیالات پر مشتمل ایک مقالہ لکھنا چاہا اور اس ضمن میں حضرت علامہ سے تصریحات چاہیں ۔ آپ نے اس گفتگو میں جو ارشادات فرمائے وہ قابل غور ہیں ۔ ۴ ، جنوری ۱۹۳۸ء کے ملفوظات میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں :

''میں نے کہا ایک مسئلہ ہے ارشاد ہو تو عرض کروں ۔ فرمایا کیا ؟ میں نے عرض کیا یہ زمانہ سرمائے اور محنت کی کشمکش کا ہے ۔ ایک طرف اشتراکیت ہے ، دوسری جانب سرمایہ داری ۔ ارشاد ہوا ٹھیک ہے لیکن تمہارا سوال کیا ہے ؟ ''عرض کیا کہ سوال یہ ہے کہ مسائلِ دولت پر گفتگو کیجیے یا فلاح عامہ کا ذکر چھیڑیئے یا کوئی ایسی بات کیجیے جس سے سیاسی اور معاشی انصاف کا پہلو نکلے تو لوگ بدظن ہو جاتے ہیں ۔ مزدور کا حق زبان پر لائیے تو اعتراض ہوتا ہے ۔ یہ اشتراکیت کی منطق ہے ۔ اس سے مادیت اور لادینی کی بُو آتی ہے ۔ فرد کی صلاحیتوں ، حریت اور آزادی پر زور دیجیے تو معترض سمجھتا ہے کہ سرمایہ داری کی حمایت کی جا رہی ہے ۔ حضرت علامہ بتوجہ میری معروضات سن رہے تھے ۔ فرمایا ''جو کچھ تم کہہ رہے ہو تمہارے سوال کی تمہید ہے ، سوال کیا ہے ''؟

میں نے طوالتِ کلام پر معذرت کرتے ہوئے عرض کیا سوال یہ ہے کہ بحالت موجود ہمارے سامنے دو ہی نظام ہیں ۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری ۔ دونوں ایک دوسرے سے متصادم ایک دوسرے کی ضد ۔ مگر دونوں اس امر کے دعویدار کہ انسان کی بھلائی انھیں میں ہے ۔ اسلام بظاہر دونوں کے خلاف ہے گویا یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اس میں دونوں کی گنجائش ہے ۔ حالانکہ یہ دونوں نظام باہم جمع نہیں ہو سکتے ۔ اندریں صورت ہم کیا کہیں کہ اسلام کی روش سرمایہ اور محنت کے بارے میں کیا ہے ؟ یعنی اس کے نظام اجتماع و

عمران میں سیاست اور معاش کو باہم تعلق کیا ہے ؟ باالفاظ دیگر وہ کیا نظامِ معیشت ہے جو از روئے شریعت وجود میں آئے گا ؟

ارشاد ہوا ''تم ابھی تک اپنا سوال متعیّن نہیں کر سکے ۔ تم نے جو بات کہی وہ ایک طویل اصولی بحث ہے ۔ تمھارا ذہن اس بحث کی طرف منتقل ہوا تو کیونکر ؟ تمھاری مشکل کیا ہے ؟'' میں نے عرض کیا زمین کی ملکیت اور عدم ملکیت کا مسئلہ ہے اس لیئے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی بحث میں سرِ دست یہی مسئلہ ہمارے سامنے ہے ۔ کارخانہ داری کی تو ابھی ابتدا ہے ۔ یہ مسئلہ طے ہو جائے تو بحیثیت ایک قوم ہم اپنا مؤقف بھی متعیّن کر سکیں ۔ نہ یہ کہا جائے کہ دین سے انحراف ہو رہا ہے ۔ نہ یہ کہ دین کیا ہے ؟ محض سرمایہ داری کا پردہ !

ارشاد ہوا ''زمین کے بارے میں شریعت کے احکام واضح ہیں ۔ قرآن پاک نے صاف اور صریح الفاظ میں کہہ دیا ہے ''الارض للّٰہ'' (جیسے الملک للّٰہ ، الحکم للّٰہ) البتہ اس سلسلے میں جو مشکل ہے وہ یہ کہ اسلام جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں دین ہے مذہب نہیں ۔ لہذا جہاں تک سیاسی اور معاشی مسائل کا تعلق ہے ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک عمرانی تحریک بھی ہے ۔ لیکن یہی نکتہ ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا ۔ لہذا اس سلسلے میں جو بے سر و پا سوالات اٹھائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام ہمارے سامنے نہیں آیا ۔ یہ نظامِ مدنیت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعور ملی بیدار ہوگا اور وہ سمجھیں گے کہ حیات ملّی عبارت ہے ایک سیاسی اجتماعی مئیت سے نہ کہ ایک اخلاقی اور مذہبی نظام سے ۔ ذرا اس شعور کو بیدار ہو لینے دو زمانہ خود ہی سمجھا دے گا کہ مسائل کیا ہوتے ہیں اور ان کا ہر پہلو واضح طور پر سامنے رکھو ۔ مدار بحث بھی سر تا

سر اسلام ہی کو ہونا چاہیے - جو کچھ لکھو اصولاً اور با احتیاط -۳۲

اسلام اور مسئلہ حقوق و فرائض

اسلام کا نظامِ معیشت ، اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے قطعی طور پر مختلف ہے کیونکہ یہ نظامِ معیشت ایک ایسی عمرانی تحریک سے معرض وجود میں آتا ہے جو بنی نوع انسان کی وحدت کی بنا پر اخلاقی جد و جہد کرنے والے روحانی الذہن افراد سے تشکیل پاتی ہے ، جس میں معیشت اور نیکی ایک دوسرے کو پروان چڑھاتے ہیں - ہر زمانے میں طریق پیداوار کے بدل جانے سے چونکہ نظامِ معیشت کا ڈھانچہ بھی تبدیل ہو جاتا ہے - اس لیے اس میں انفرادای اور اجتماعی حقوق میں تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے - اسلام اس تصادم کو روکنے کی جو تدبیر کرتا ہے وہ نفسیاتِ انسانی میں ایک حد درجہ اہم تبدیلی ہے جس کی رو سے طلبِ حقوق پر زور دیا جاتا ہے اس نکتے کو ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے ، وہ فرماتے ہیں -

''جاہل اور کافرانہ معاشرہ مطالبۂ حقوق کے اصرار پر قائم ہوتا ہے - چاہے وہ اصرار جمہوری اور سرمایہ داری نظام میں انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی کے لیے ہو یا اشتراکی نظام میں اجتماعی حقوق کے لیے - اس لیے دونوں نظاموں میں انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم ہمیشہ برقرار رہا ہے - جب تک حقوق کا یہ تصادم رفع نہ ہو معاشرہ اسلامی نہیں بن سکتا - اسلام کی برتری اس وقت واضح ہو گی - جب انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم ایک واقعہ ہو اور سوال یہ پیدا ہو کہ اسلام اس تصادم کی پیش بینی کر کے اسے کسی حتمی ، قطعی اور یقینی تدبیر سے دور کرتا ہے جس کا جواب یہ ہے کہ اسلام جس قسم کا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں اخلاقی جدوجہد کرنے والے افراد کی سیرت کی خصوصیت

یہ ہوتی ہے کہ محرک اعمال فرض کی بجا آوری کی نیّت ہو اور اگر اصرار فرائض کی بجا آوری پر ہو تو حقوق، خواہ وہ افراد کے ہوں یا اجتماع کے، حاکم کے ہوں یا محکوم کے، خود بخود ادا ہو جائیں گے اور انفرادی اور اجتماعی حقوق کا تصادم دور ہو جائے گا اس کے برعکس جاہل اور کافرانہ معاشروں میں مطالبۂ حقوق پر اصرار دشمنی کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جو حقوق طلب کرتا ہے اس کا ذہن بھی معاندانہ ہوتا ہے اور جس سے حقوق طلب کیے جاتے ہیں اس کی نفسیات میں جواباً عناد کی نفسیات بن جاتی ہے جس کی وجہ سے معاشرہ کے اندر حقوق کے تصادم کا رفع ہونا ناممکن ہو جاتا ہے"[۲۳]۔

ملکیتِ زمین کے تین اصول

خلاصۂ کلام یہ کہ مسئلہ ملکیت کے بارے میں علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے اس کا منتہا اور مقصود در حقیقت زمین کے بارے میں قرآن کا آفاقی نقطۂ نظر پیش کرنا ہے، ملکیتِ زمین کے بارے میں کسی قسم کا حتمی، آئینی یا قانونی فیصلہ دینا نہیں البتہ ملکیتِ زمین کے ضمن میں جو تین اصول آپ کی مختلف تحریروں سے مترشح ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام میں زمین پر انسان کی ملکیتِ مطلقہ کا کوئی تصوّر نہیں بلکہ کفالتِ عامہ کے نقطۂ نظر سے استفادۂ زمین ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔

۲۔ زمین پر محنت اور کاشت کرنے کے حقوق کا تحفّظ جس سے معاشرے میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔

۳۔ ایسے معاشی نظام کی تشکیل جس میں خودی کی نشو و نما کی پوری ضمانت ہو۔

باب سوم

زمین بطور متاع اور امانت

زمین کے متاع ہونے کا قرآنی تصوّر جس پر علامہ اقبال نے اس قدر زور دیا ہے، نہ صرف اپنے اخلاقی اور روحانی مضمرات کی بنا پر اہمیت رکھتا ہے بلکہ زرعی منصوبہ بندی میں اس کے عملی اور اطلاقی امکانات بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں۔ ''ملکیت'' کے معنی کسی چیز کو اپنے قبضہ یا اختتار میں لینے اور ''متاع'' کے معنی سامان اور پونجی کے ہیں۔ چنانچہ لُغت کے اعتبار سے بھی اگرچہ دونوں کے مفہوم میں فرق ہے لیکن قرآنِ حکیم اپنے الفاظ کو بالعموم خود اپنی طرف سے بھی مخصوص معنی عطا کرتا ہے اور ہمارے لیے یہی معنی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، کیونکہ قرآن کی حیثیت ایک ادب کی کتاب نہیں بلکہ کتاب الہدیٰ کی ہے۔ ذرا غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآنِ حکیم جب ''متاع'' کے لفظ کو حیاتِ دنیا کے ساتھ استعمال کرتا ہے تو حیاتِ دنیا کی بے ثباتی کے حوالے سے اس لفظ میں ''عارضی'' اور ناپائیدار'' کا مفہوم داخل کر دیتا ہے۔ علامہ اقبال جب بھی زمین کے بارے میں متاع کا لفظ استعمال کرتے ہیں، انھی معنوں میں کرتے ہیں۔

کسی شے کی ملکیت کا تصوّر جب انسانی ذہن میں راسخ ہو جائے اور رغبت نفس اور محبّت کی صورت اختیار کرکے اسے زندگی کی اعلیٰ اقدار سے غافل کر دے تو قرآنِ حکیم انسانی فکر کی اس

کجروی کی اصلاح کے لیے ''متاع'' کا تصوّر دیتا ہے ، جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے -

''لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس عورتیں ، اولاد ، سونے چاندی کے ڈھیر ، چیدہ گھوڑے ، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئیند بنا دی گئی ہیں - مگر یہ سب چند روزہ زندگی کی ''متاع'' ہیں - حقیقت میں جو بہترین ٹھکانہ ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے''[1]

ملکیت اور متاع کا بنیادی فرق

مندرجہ بالا آیت ''ملکیت'' اور ''متاع'' کے بنیادی فرق کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے - ملکیت کے تصوّر میں پائیداری اور مستقل ہونے کا مفہوم ملتا ہے - جب کہ متاع کے تصوّر میں ناپائیداری اور عارضی استفادہ کے معنی پائے جاتے ہیں - ایک دوسری جگہ قرآن میں ملکیت کے تصوّر پر کاری ضرب لگانے کے لیے ''غرور'' یعنی دھوکا کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے - درآنحالیکہ وہ اس دنیا کو بھی ایک حقیقت تسلیم کرتا ہے - در حقیقت اس دنیا کی تمام چیزوں کے بارے میں مومن ''متاع'' کا تصوّر رکھتا ہے اور یہی مومن کی نفسیات اور پاکیزگیٔ اخلاق ہے - لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ جہاں ہم انصارِ مدینہ کی اس نفسیات کو اخلاقی فضیلت کا کمال مانتے ہیں کہ انھوں نے ایک موقع پر اپنی ایک سے زائد بیویوں کو طلاق دے کر ان کے نکاح مہاجرین مکّہ سے کر دینے میں بھی کوئی گرانی محسوس نہیں کی[2] وہاں ہم ملکیت زمین کے سوال پر اپنے اندر کوئی معمولی سے معمولی تبدیلی پیدا کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں - حالانکہ پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے قطعاتِ اراضی کی حد بندیوں سے قائم ہونے والا انتہائی فرسودہ ملکیتی تصوّر معاشی ترقی اور معاشی انصاف دونوں کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے -

این ایف پیٹرسن زراعت کو ایک معاشرتی عمل قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"زراعت کا کام بہت بڑی حد تک ایک معاشرتی عمل ہے۔ جوں جوں زراعت زیادہ منظّم ہوتی جاتی ہے توں توں یہ معاشرتی تنظیم کے لیے زیادہ حساس ہوتی جاتی ہے۔ شمالی امریکہ، بہت سے یورپی ممالک اور جاپان میں زراعت اور معاشرتی تنظیم کے مابین ضروری معاشرتی توافق پیدا کر لیا گیا ہے"[۳]۔

زراعت میں ایک بڑی معاشرتی اختراع زمین کی نجّی ملکیت کا تصوّر تھا جس نے زمین کو عام دخل اندازی سے محفوظ رکھا اور اس طرح حالات پر قابو پا کر اس میں فصل کاشت کرنے کے مقاصد کو ممکن بنایا۔ پھر اس طرح صنعتی انقلاب بھی ایک عظیم معاشرتی اختراع تھا۔ جس نے گونا گوں طریقوں سے زراعت کو مثبت طور پر متاثر کیا ان میں سے ایک طریقہ فاضل غذائی اجناس کے لیے بڑی بڑی منڈیاں فراہم کرنا تھا۔

اسلامی فقہ اور زمینی حد بندی

ہماری فقہ نے جس زمانے میں حد بندی کی بناء پر قائم ہونے والے تصوّر کو قانونی تحفّظ دیا اس زمانے کے زرعی مسائل اور پیداواری طریقے بالکل مختلف نوعیت کے تھے۔ اس لیے اس قسم کی زمینی ملکیت کو تسلیم کرنا، برقرار رکھنا اور تحفّظ دینا بالکل بجا اور روا تھا۔ اس دور کے پیداواری طریقوں کے مطابق زراعت میں پیمائش رقبہ ہی پیمائش معاش کا واحد پیمانہ تھا۔ اس لیے قطعاتِ زمین کی حد بندی کو قانونی تحفّظ دینا ناگزیر تھا اور یہ صورت چونکہ صدیوں تک قائم رہی۔ اس لیے زمین کے سلسلے میں حد بندی ہی ملکیت کی واقعاتی اور قانونی علامت قرار پائی۔ لیکن اس سے زمینی

محبت اور زمین پیوندی کے جو جذبات ہمارے کاشتکاروں کے دلوں میں گھر کر گئے ہیں وہ مطعون ہونے کے بجائے ہمارے نزدیک ''انسان کی فطرت'' ''انسان کا شرف'' اور ''بنیادی انسانی حقوق'' کے ناموں سے ''تقدس'' کا درجہ پا گئے ہیں ۔ حد بندی کی وٹوں کو قائم رکھنے یا مٹانے پر کسان اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے اور تصورِ ملکیت کو کسی صورت چھوڑنے پر تیار نہیں ۔ خواہ یہ مفاد عامہ کے لیے کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو اور خواہ اس میں اس کا اپنا ذاتی اقتصادی مفاد ہی کیوں نہ ہو ۔ اس قسم کی حد بندی پر مبنی تصورِ ملکیت پر اصرار کی سہمل ترین مثال کومیلا (بنگلہ دیش) میں کوآپریٹیو فارمنگ کے تجربے کے ضمن میں ملتی ہے اس تجربے میں یہ کیا جاتا تھا کہ مختلف ملکیتوں کے ٹکڑوں کی حد بندیوں کو وٹوں کی بجائے کھونٹیاں گاڑ کر پورے قطعہ میں ٹریکٹر سے قلبہ رانی کی جاتی اور بعد میں پھر کھونٹیوں کے نشانات کی مدد سے دوبارہ وٹیں قائم کر لی جاتیں[۴] ۔

تصورِ متاع کا شجرِ طیبہ

زمینی ملکیت پر اس قسم کا سہمل اصرار اس زمانے میں صرف معاشی ترقی میں ہی روکاوٹ نہیں ہے بلکہ زمین کے بارے میں تصورِ ملکیت اور تصورِ متاع سے دو مختلف نظریہ ہائے حیات کے شجر پھوٹتے ہیں ۔ تصورِ ملکیت کے بیج سے وہ شجرِ خبیثہ پھوٹتا ہے جو سراسر دنیوی طرزِ فکر کے برگ و بار پیدا کرتا ہے ۔ امریکی صدر جیفرسن نے اپنی تحریروں میں زمینی ملکیت پر زور دیا کیوں کہ اس کے نزدیک اس سے نظریۂ وطنیت اور جمہوریت کو فروغ ملتا ہے ۔ اس کی تشریح وہ یوں کرتا ہے کہ زمین کا مالک کاشت کار اپنی زمین پیوندی کی وجہ سے ہمیشہ محبِ وطن ہوتا ہے ۔ بلکہ وہی نظریہ وطنیت کا بنیادی پتھر ہے اور چونکہ وہ اپنے کھیت

میں آزادانہ فیصلے کرتا ہے ۔ اس لیے جمہوریت نوازی (یعنی ایسی آزادی جو اس کے ذاتی مفادات کی حفاظت کر سکے) اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے[۵] ۔ لیکن اسلام انسان کو زمینی رشتہ کے بارے میں متاع کا تصوّر دے کر اسے تصوّرِ آخرت سے مربوط کرتا ہے ۔ اس لیے اس سے جو شجرِ طیّبہ پھوٹتا ہے، اس کی جڑیں سیاسیات (یعنی خلافت) میں نہایت مضبوطی سے پیوست شاخیں اخلاقیات میں آسمانوں کی پہنائیوں تک پھیلتی ہوئی اور معاشیات (رزق) میں ہر آن بار آوری کے نتائج پیدا کرتی رہتی ہیں ۔ بقول اقبال

کھینچیں نہ اگر تجھ کو چمن کے خس و خاشاک
گلشن بھی ہے اک سر سرا پردہ افلاک[۶]

وطنیت کی اساس

باربرا وارڈ (Barbara Ward) بھی اس خیال کی موید ہیں کہ زمینی ملکیت کا تصوّر ہی پرانے زمانوں میں سلطنتوں کے قیام و انصرام کا باعث اور دورِ حاضر میں وطنّیت کی اساس بنتا تھا ۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں کہ زمینیں جب سردارِ قبیلہ کی ملکیت بن جاتی تھیں تو سردار قبیلہ کو حکمرانی کا منصب خود بخود مل جاتا تھا اور قبائل کے زیادہ سے زیادہ سردار اور جاگیردار جب کسی ایک بڑے سردار کی وفاداری کا دم بھرنے لگتے تھے تو سلطنت قائم ہو جاتی تھی ۔ تمام بڑی بڑی سلطنتیں اس بنیاد پر معرض وجود میں آئیں[۷] ۔ برّصغیر ہند و پاک میں انگریز نے بھی اسی مقصد کے پیشِ نظر جاگیرداری کو فروغ دے کر اپنے وفادار پیدا کیے ۔ اس نظامِ جاگیرداری کے تحت اسلامیہ کا سوادِ اعظم تو معاشی بدحالی میں مبتلا ہو گیا اور ایک مختصر اقلیت عیش کوشی میں لگن انگریز کی وفاداری کا دم بھرتی رہی اور اعلیٰ مسلّمی مقاصد کی ان کے دل میں کوئی اہمیت نہ رہی ۔ پنجاب میں اس کی بد ترین مثال یونینسٹ پارٹی کی سیاست

تھی - جس سے علامہ اقبال اپنے آخری ایّام میں بھی دل گرفتہ رہے۔ سید نذیر نیازی ۲۶ فروری ۱۹۳۸ء کے ملفوظات میں رقم طراز ہیں۔

"پنجاب کا ذکر آ گیا فرمایا - سارا معاملہ پنجاب کے زمینداروں کا ہے - پنجاب کے زمیندار کب سمجھیں گے ؟ انھیں کب احساس ہو گا ؟ یونینسٹ پارٹی کی سیاست بڑی ناقص ہے"۔

ہم نے بات کو طول نہیں دیا - حضرت علامہ کا اشارہ شاید اس امر کی طرف تھا کہ سیاسی اعتبار سے جب یہ طے ہے کہ زمینداروں کا یہ ٹولہ جسے یونینسٹ پارٹی کہا جاتا ہے ، ہمیشہ ہندوؤں اور سکھوں کی امداد و تعاون کا محتاج رہے گا تو یہ بھی ممکن ہے کہ آگے چل کر یہی محتاجی ان کے انفرادی مفاد کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے - اسے اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے یا محض معاشی فلاح و بہبود کے خیال سے ، ان کی رجعت پسندی میں کوئی شبہ نہ تھا - لہذا کوئی بھی نقطہ نظر ہو اسلامی یا محض معاشی ، سوال یہ تھا کہ پنجاب کا زمیندار کب یہ سمجھے گا کہ زندگی صرف فصل کی کاشت اور غور پرداخت نہیں ہے - اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے - یہ بہرحال نہیں ہے کہ انسان کی توجہ تمام عمر زمین ہی پر مرتکز رہے - مذہب و سیاست کی طرح اسے علم و حکمت سے بھی کوئی دلچسپی نہ ہو جیسے بجُز کاشتکاری زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں[۸] -

قرآن حکیم کی دو مثالیں

قرآن حکیم نے دو مختلف مقامات پر ملکیت کے تصوّر سے پیدا ہونے والے نفسیاتی مفاسد کا ذکر بڑے بلیغ پیرائے میں کیا ہے - جو موجودہ دور کے جاگیرداروں پر بھی پوری طرح منطبق ہوتے ہیں - ایک واقعہ سورہ کہف (آیت ۳۲ تا ۴۴) میں بیان کیا ہے جس

میں باغات کا مالک اپنی دولت اور خوشحالی کے نشے میں بد مست ہو کر حقوق اللہ سے غافل ہو گیا تھا ۔ اور اس کے باغات برباد کر دیئے گئے اور دوسرا واقعہ سورہ قلم (آیت ۱۷ تا ۲۷) میں بیان ہوا ہے جس میں مالک زمین حقوق العباد سے غافل ہو جاتا ہے اور نتیجۃً اس کی فصل بھی برباد کر دی جاتی ہے ۔ ان نفسیاتی مفاسد کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ زمین کے بارے میں متاع اور امانت کے تصورات عام کیے جائیں اور ان تصورات کی روشنی میں زرعی نظام کی تنظیمِ نو کی جائے ۔

زرعی نظام کی تنظیمِ نو

قیامِ پاکستان کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ زرعی نظام کی تنظیمِ نو پر سب سے پہلے توجہ کی جاتی لیکن سیاسی اور معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ خرابی اسی شعبے میں پائی جاتی تھی ۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے تو شاید حکومت اور ملّت دونوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے لیکن افسوس ایسا نہ ہوا ۔ جاگیرداری جوں کی توں برقرار رہی اور ملک کی اسّی (۸۰) فیصد زراعت پیشہ آبادی کی سیاسی ، سماجی اور معاشی اصلاح کا کوئی پروگرام وضع نہ کیا جا سکا ۔ زرعی اصلاحات (اپنی تمام تر کمیوں کے ساتھ) ۱۹۶۰ء سے پہلے نافذ نہ ہو سکیں ۔ در حقیقت ۱۹۶۸ء سے پہلے سیاسی جماعتوں نے زرعی مسائل پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی بلکہ انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو زرعی معاملات کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کا زیادہ تر کریڈٹ سابق صدر ایوب کو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تقاریر میں بار بار دیہی اور زرعی مسائل کا ذکر کر کے انھیں قومی توجہ کا مرکز بنا دیا جس کے رد عمل میں مخالف سیاسی جماعتوں کو بھی اپنے منشوروں میں زرعی مسائل کو اہمیت دینی پڑی ۔ بلکہ اب تو کئی سیاسی اور نیم سیاسی

تنظیمیں خالص زراعت پیشہ آبادی کی فلاح و بہبود کے لیئے قائم ہو گئی ہیں ۔ زراعت کے شعور کو ابھارنے میں زراعت میں نئی ٹیکنالوجی کے نفاذ کی وجہ سے پیش آمدہ معاشی پیچیدگیوں کو بھی دخل ہے چنانچہ تحدیدِ ملکیتِ زمین کا مسئلہ بھی انھیں دنوں اٹھا اور کم و بیش تمام جماعتوں نے تحدید ملکیت زمین کے اصول کو اصولاً تسلیم کر لیا ۔ تحدید ملکیت زمین پر اجماع اُمّت ہونے کی وجہ سے اب کھیت کی حد بندی کا وہ ''تقدس'' قائم نہیں رہا ۔ جس پر مذہبی حلقوں کی طرف سے اس شدّت سے اصرار کیا جاتا تھا کہ گویا یہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے اور اب شاید تصوّر متاع کی بنیاد زراعت کی تنظیمِ نو پر بھی سنجیدگی سے غور کرنا ممکن ہو سکے ۔

تنظیمِ نو کے لیے لائحہ عمل

زرعی نظام کی تشکیلِ نو میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ استحصال کی ہر صورت کو ختم کر دیا جائے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ جاگیرداری کی کسی صورت کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے ۔ البتہ وہ بڑے زمیندار جو کاشت کاری کو جدید ترین طریقوں کو اپنا کر زمین سے پوری پوری پیداوار حاصل کرنے پر قادر ہوں ، ان سے تعرض نہیں کرنا چاہیے ۔ مگر ان پر یہ پابندی ضرور لگنی چاہیے کہ وہ اپنی رہائش بھی گاؤں ہی میں رکھیں ۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ چونکہ ہمارے دیہات میں ذرائع رسل و رسائل نہ ہونے کے برابر ہیں ، تعلیمی ، طبّی اور حفظانِ صحت کی سہولتوں کا فقدان اور تفریحی اور تہذیبی مشاغل کی کمی پائی جاتی ہے ۔ اس لیے خوشحال متموّل زمیندار وہاں رہنا پسند نہیں کرتے اور شہروں کی طرف رجوع کر رہے ہیں اور دیہی علاقوں کی دولت تمام تر کھنچ کر شہروں میں آ جاتی ہے دیہی علاقے اپنی پیدا کردہ دولت کی برکات سے محروم رہ جاتے ہیں اور دیہی زندگی کی

روائتی پسماندگی کا سنگین جمود ٹوٹنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ اس صورت حال کی بد ترین مثال جنوبی امریکہ کے ایک ملک ارجنٹائن میں ملتی ہے جو رقبے میں پاکستان سے کئی گنا زیادہ ہے ۔ زرعی اعتبار سے بھی یہ ملک بہت زرخیز ہے اور مویشی پالنے میں کافی شہرت رکھتا ہے ۔ ہر سال لاکھوں کروڑوں من گوشت اور اون یورپ اور دیگر ممالک کو برآمد کرتا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود وہاں دیہی معاشرہ کی معاشی حالت ہماری دیہی آبادی سے بھی بد تر ہے ۔ جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اگرچہ وہاں بڑی بڑی زمینداریاں ہیں لیکن کسی بھی زمیندار کو اپنے دیہی علاقے میں رہنا گوارا نہیں ۔ ملک بھر کے زمیندار صرف ایک شہر بیونوس آئرز میں رہتے ہیں جو اس ملک کا دارالحکومت ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک بھر کی پیدا کردہ زرعی دولت تمام تر ایک ہی شہر میں سمٹ آئی ہے جو امرا کی عیش کوشیوں کا مرکز بن گیا ہے اور اس ملک کے دیہی علاقے اپنی پیدا کردہ دولت کی آسائشوں سے یکسر محروم ہیں ۔ ایسی ہی صورتِ حال پر علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار منطبق ہوتے ہیں ۔

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا

اس کے آب لالہ گوں کی خون دہقان سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا

اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے ؟ مردِ غریب و بے نوا[۹]

علامہ اقبال بڑے بڑے شہر قائم کرنے کے اسی لیے خلاف تھے ۔ چنانچہ مسولینی سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو آپ نے اسے یہ مشورہ دیا کہ بڑے شہروں کے بجائے چھوٹے چھوٹے شہر بسائے

جائیں ۔ کیونکہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی ہے اس کی تہذیبی اور اقتصادی توانائی کم ہو جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکات شر لے لیتے ہیں[۱۰]۔

ہیں گرچہ بلندی میں عمارات فلک بوس
ہر شہر حقیقت میں ہے ویرانہ آباد[۱۱]

مسولینی سے گفتگو کے دوران آپ نے اس پر یہ بھی واضح کیا تھا کہ یہ ان کا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے آج سے صدیوں پہلے یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو اس پر آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے[۱۲]۔

اگر منصوبہ بندی میں اس ہدایت کو پیشِ نظر رکھا جاتا تو آج نہ صرف ہماری دیہی آبادی کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا بلکہ ہماری اقتصادیات بھی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتی ۔ مثال کے طور پر اگر کسی ایک صنعت مثلاً پارچہ بافی کے تمام کارخانے ایک دو بڑے شہروں میں قائم کرنے کے بجائے کپاس پیدا کرنے والے علاقے میں ریلوے لائن یا سڑک کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کر دیے جاتے تو ایسی صورت میں ملک مجموعی طور پر ترقی کرتا اور زمین پر سے غیر ضروری انسانی بوجھ دور کرنے میں بھی آسانی رہتی یعنی زمین سے کاشتکاروں کا انخلا بطریقِ احسن ممکن ہوتا ۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا اگر زراعت اور صنعت کے باہمی تعلق کو نگاہ میں رکھتے ہوئے انھیں ایک دوسرے سے مربوط طریقے پر ترقی دینا پیشِ نظر ہوتا ۔

دورِ حاضر میں اقتصادی ترقی کا معیار

دورِ حاضر میں اقتصادی ترقی کا معیار یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ صنعت میں منتقل ہوں ۔ ایک ماہر اقتصادیات کذنٹ کی رائے کے مطابق اقتصادی ترقی متصوّر ہی اس وقت ہوتی ہے ۔ جب کسی ملک میں زراعت پیشہ آبادی ساٹھ فیصد سے کم ہونی شروع ہو جائے ۔ وہ ساٹھ فیصد یا اس سے زائد زراعت پیشہ آبادی رکھنے والے ملک کو پسماندہ اور اس سے کم کاشت کار رکھنے والے کو ترقی پذیر اور جوں جوں یہ شرح کم ہوتی جائے اس نسبت سے اس کو ترقی یافتہ ملک شمار کرتا ہے ۔ امریکہ میں جہاں زراعت پیشہ آبادی مجموعی آبادی کے چھ فی صد سے بھی کم ہے ، زراعت سے متعلقہ صنعتوں میں (جو درحقیقت امریکی زرعی نظام کا اہم حصّہ بلکہ بنیاد ہیں) کام کرنے والی آبادی پینتیس فی صد ہے جو زراعت کی مضبوط پشت پناہی کر رہی ہے ۔ ایک اندازے کے مطابق وہاں کھیت میں کام کرنے والے ہر کسان کی زرعی ضروریات (مثلاً کیمیاوی کھاد ، حشرات کش ادویہ ، زرعی مشینری اور دیگر آلات وغیرہ) کو پورا کرنے کے لیے تین فرد شہروں کا کام کر رہے ہیں ۔ زرعی مارکیٹنگ کے وسیع نظام میں کام کرنے والے لوگوں کی تعداد الگ ہے اور زرعی تحقیق و تفتیش ، زرعی تعلیم اور زرعی توسیع اور سیڈ کمپنیوں میں کام کرنے والے لوگ ان کے علاوہ ہیں ۔ اگرچہ بظاہر ان تمام لوگوں کو ”کسان“ کہنے کا کوئی جواز نہیں اور زراعت کی مروجہ تعریف کے مطابق یہ کسان نہیں کہلاتے لیکن دورِ حاضر کے پیچیدہ زرعی نظام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان تمام لوگوں کو کسان ہی شمار کرنا پڑے گا ۔

زراعت اور صنعت کا رشتہ

زراعت اور صنعت کے باہم دگر منحصر ہونے کی وجہ سے جدید

زراعت میں سائنس اور تکنیکی تبدیلیوں کو لانا اور مؤثر بنانا ایک نہایت پیچیدہ اقتصادی عمل ہے اور اس بات کا اہتمام کرنا ضروری ہے کہ ساتھ ہی ساتھ سماجی ڈھانچے بھی کسی صدمے (Shock) کے بغیر تبدیل ہو جائیں۔ دنیائے غرب میں چونکہ زراعت اور صنعت میں سائنسی اور تکنیکی تبدیلیاں ایک طویل عرصے میں پھیلی ہوئی مدّت میں آہستہ آہستہ رونما ہوئیں۔ اس لیے وہ سماجی ڈھانچے میں آسانی کے ساتھ جذب ہوتی گئیں۔ لیکن ترقی پذیر ممالک میں یہی عمل (جو یورپ اور امریکہ میں صدیوں میں تکمیل پذیر ہوا) جب عشروں میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو معاشرہ میں دھماکوں اور جھٹکوں کا محسوس ہونا بالکل ایک قدرتی عمل ہے۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک پسماندہ ملک میں صنعتی ترقی کے لیے سارا سرمایہ زراعت ہی کے شعبے سے نچوڑ کر مہیا کیا جاتا ہے۔ کینتھ بولڈنگ (Kenneth Boulding) نے اسی لیے تو کہا ہے:

It is the turnip and not the spinning jenny which is the father of industry.

یعنی ''صنعت کا باپ چرخہ نہیں بلکہ شلغم ہے''[۱۳] اور یہ ایک مجبوری ہے جس کی وجہ سے زراعت کے شعبے میں غربت پلتی ہے۔ دیہی لوگ غربت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں کہ وہ شہروں کا رخ کیا کریں لیکن امداد باہمی کے اصول پر پورے کاروبار زراعت کو منظّم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اس مشکل میں ان کا جذبۂ ملکیت زمین ہی ان کی زنجیرِ پا بنتا ہے۔ لیکن اگر وہ ملکیت زمین سے اتنی محبت نہ رکھیں اور زمین کی حد بندی سے محبت کے بجائے اپنے پیشے کو اقتصادی اعتبار کے نفع بخش بنانے کی سعی کریں تو اس مشکل سے نجات کا راستہ نکل سکتا ہے۔ متاع کے تصوّر میں چونکہ عارضی تمتع کی ذہنیت تشکیل پاتی ہے اس لیے یہ تصوّر کوآپریٹو فارمنگ کے مزاج سے سازگار ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان میں تصوّرِ متاع کی بنیاد پر زرعی منصوبہ بندی کی کوشش نہیں کی گئی[۱۴]۔

باب چہارم

جدید زرعی مسائل پر علامہ اقبال کے نظریات کا اطلاق

زراعت ایک معاشی عمل ہے جس میں زمین ، محنت اور سرمایہ کے بہترین امتزاج اور موثر باہمی تعامل سے پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے ۔ لیکن پیداواری طریقوں کی تبدیلی سے ان وسائل کے باہمی تعامل اور امتزاج کی صورت ہر دور میں بدلتی رہتی ہے ۔ ایک وقت تھا کہ زرعی عمل میں زمین کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی ۔ کیونکہ اس زمانے میں پیداوار بڑھانے کا صرف ایک ہی طریقہ معلوم تھا اور وہ یہ تھا کہ زیر کاشت رقبہ بڑھایا جائے ۔ یعنی جہاں ایک ایکڑ زمین سے دس من گندم پیدا ہوتی تھی وہاں بیس من گندم پیدا کرنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ دو ایکڑ میں گندم کاشت کر دی جائے ۔ رفتہ رفتہ زراعت میں ہنر مندی کا دور شروع ہوا ۔ جس میں کاشت کار کے تجربے اور محنت کو اہمیت حاصل ہوئی ۔ ایک مشہور اور قدیم لوک کہانی میں جس بوڑھے دہقان نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو کھیت میں خزانہ دفن ہونے کی خبر دے کر بالواسطہ ''دب کے واہ ، رج کے کھا'' کا عملی سبق ذہن نشین کرایا تھا وہ یقیناً اس دور کا ایک ترقی پسند کاشتکار تھا لیکن بیسویں صدی میں زراعت ایک فن اور ہنر کی بجائے ایک سائنس اور صنعت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ جس میں پیداوار بڑھانے کے لیے ''دب کے

واہ'' کا سادہ نسخہ بڑی حد تک اپنی عملی افادیت کھو چکا ہے اور فصلوں کی نئی اقسام کے بیجوں اور مصنوعی کھادوں کے استعمال کی وجہ سے زرعی پیداوار بڑھانے کی جہت اب آفقی کے علاوہ عمودی ہو گئی ہے - ترقی یافتہ زراعت کا مسئلہ اب ہرگز یہ نہیں ہے کہ زمین پر زیادہ سے زیادہ کاشت کار مشقت کریں بلکہ یہ ہے زمین سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ''بیدخل'' کرکے زرعی پیداوار کو صنعتی اصولوں پر بڑھایا جائے - چنانچہ ترقی پذیر زراعت میں ''جیہڑا واہوے ، اوہو کھاوے'' کے اصول پر اصرار فنی اور تکنیکی اعتبار سے ترقی کی راہ میں زبردست رُکاوٹ شمار کیا جاتا ہے -

صنعتی زراعت کے اثرات

سائنس اور صنعتی زراعت سے کیا مراد ہے ؟ اس کا تصوّر واضح کرنے کے لیے یہاں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مثال کا بیان ضروری ہوتا ہے جو سائنس اور صنعتی زراعت کا پیشرو ملک شمار ہوتا ہے اور جہاں زراعت حقیقی معنوں میں اور مکمل طور پر صنعت بنتی جا رہی ہے - ۱۹۳۷ء میں ایک امریکی کاشتکار صرف دس افراد کی خوراک پیدا کر سکتا تھا - ۱۹۵۰ء میں وہ پندرہ افراد کی خوراک پیدا کرنے کے قابل تھا اور ۱۹۵۹ء میں وہ چوالیس افراد کی خوراک پیدا کرنے پر قادر تھا - اس کی کارکردگی میں یہ نمایاں فرق ان فنی اور تکنیکی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے جو زراعت میں رونما ہوئیں بلکہ یوں کہیے کہ اب زراعت کا حصّہ بن چکی ہیں - زراعت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمل دخل کا یہ عالم ہے کہ اب ایسے خودکار ٹریکٹر ایجاد کیے جا چکے ہیں جن کو چلانے کے لیے کسی ڈرائیوار کی ضرورت نہیں بلکہ کاشتکار اپنے گھر کے کسی آرام دہ حصّے میں ایک کنٹرول روم میں بیٹھ کر ریڈیائی کنٹرول کی مدد سے کھیت میں ہل چلا سکتا ہے اور کنٹرول روم میں کھیتوں اور فصلوں کے نقشوں

کی مدد سے گھر میں بیٹھے بیٹھے ہل چلانے ، بیج بونے اور نلائی اور کٹائی کرنے کے تمام کام مشینوں کے ریڈیائی کنٹرول ہی سے انجام پا سکتے ہیں ۔ اس طرح ایسی مشینیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں جن کی مدد سے پچھتر ہزار مرغیوں یا پانچ ہزار مویشیوں کو خوراک کھلانے اور ان کی نگہبانی کرنے کا پورا کام صرف ایک آدمی تن تنہا انجام دے سکتا ہے ۔ ان فنی اور تکنیکی دریافتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر سال تیس لاکھ دیہی افراد دیہات چھوڑ کر شہروں کا رُخ کر رہے ہیں چنانچہ امریکہ کی ستّر فیصد آبادی شہروں میں ، جو ملک کے رقبہ کا صرف ایک فیصد ہے ، سمٹ آئی ہے جب کہ ننانوے فیصد رقبہ میں صرف تیس فیصد آبادی سکونت پذیر ہے ۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دس سالہ عرصہ میں نو لاکھ فارم اقتصادی اعتبار سے غیر نفع بخش ہونے کے باعث اپنا الگ وجود برقرار نہ رکھ سکے اور ملحقہ بڑے بڑے فارم انھیں ہڑپ کر گئے ۔ اس وقت وہاں کاروباری طرز کے بڑے بڑے فارموں کی تعداد تیس لاکھ ہے اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ آئندہ دس سال میں ان کی تعداد نصف رہ جائے گی ۔ اس طرح کاشتکاروں کی تعداد میں بھی بیس لاکھ کی کمی ہو جائے گی ۔ اگرچہ وہاں فارم کا اوسط رقبہ ساڑھے تین سو ایکڑ سے کم نہیں اور نجی ملکیتوں پر مشتمل بڑی بڑی زمینداریاں جنھیں زرعی کارخانوں (Factories on the Farm) کا نام دیا جاتا ہے ، موجود ہیں لیکن اس کے باوجود نجی ملکیتوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ۔ چند سال پیشتر وہاں زرعی اقتصادیات اور فارمی کاروبار کے ایک ماہر وائن ایکن نے پیش گوئی کی تھی کہ بیس سال بعد امریکہ میں خاندانی طرز کا ایک فارم بھی نہیں رہے گا ۔ کیونکہ زرعی کاروبار میں (زرعی مشینری ، کھادوں اور موثر ادویہ پر) اخراجات اس تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں کہ بڑے سے بڑے سرمایہ دار زمیندار کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہو گا کہ وہ تن تنہا

ان اخراجات کا متحمل ہو سکے ۔ اس لیے ملک میں بھی زراعت کا کاروبار بڑی بڑی کمپنیاں سنبھال لیں گی[1] ۔ اس وقت بھی ایک صنعتی یونٹ کے مقابلے میں زرعی یونٹ کو کہیں زیادہ سرمایہ کاری درکار ہے ۔ علاوہ ازیں زراعت میں روز افزوں تخصیص و مہارت کا یہ عالم ہے کہ ایک جائزے کے مطابق وہاں ایک اوسط درجے کے فارم پر کسان کو ایک سال کے عرصے میں زرعی نوعیت کے پانچ ہزار فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن کے لیے وہ تازہ ترین سائنسی معلومات کا متلاشی رہتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کاشت کاروں اور کھیتوں کی تعداد میں سال بہ سال کمی کے باوجود بھی محکمہ زراعت کے کارکنوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ کیا جا رہا ہے ''ٹائم'' (۱۵ اپریل ۱۹۶۳ء) میں ایک واقعہ بطور لطیفہ شامل ہوا تھا کہ امریکہ کے ایوان نمائندگان میں مشی گن کے ریپبلکن ممبر رابرٹ گرفن نے از راہ تفنّن ایک قرارداد پیش کی جس میں اس یقین دہانی کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ محکمہ زراعت کے ملازمین کی مجموعی تعداد کو کاشت کاروں کی مجموعی تعداد سے بڑھنے نہیں دیا جائے گا ۔ لیکن یہ تحریک ۲۳۰ ووٹوں کے مقابلے میں صرف ۱۷۱ ووٹ حاصل ہونے کی بنا پر مسترد ہو گئی ۔ محکمہ زراعت کے اس پھیلاؤ کے باوجود امریکی کاشت کار ابھی تک محکمہ زراعت کے معلومات رسانی کے کام سے پوری طرح مطمئن نہیں ہیں ۔ زراعت میں سائنس اور فنی تخصیص و مہارت کی اس کیفیت کے پیش نظر امریکہ کے سرکاری سالنامہ زراعت ۹۷ء میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ آئندہ دس سال میں زرعی ماہرین اور کاروباری منتظمین کی کھپت کے امکانات روشن ہیں لیکن زمیندار یعنی مالکانہ حقوق رکھنے والے کاشت کاروں کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی بلکہ زراعت میں سرمایہ کاری کے روز افزوں رجحان کے پیش نظر کاروبار زراعت میں بھی صنعتی اور کاروباری کمپنیوں کی طرح حصص خریدنے کا رواج بہت عام ہو جائے گا[2] ۔

ایک تصویر کے دو رُخ

امریکہ کی مثال کو اس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا مقصد اس بات کو واضح کرنا تھا کہ انفرادی آزادی کے اس سب سے بڑے دعویدار ملک میں بھی عملاً وہی کچھ ہو رہا ہے جو اجتماعیت و اشتراکیت کے علمبردار ممالک میں ہو چکا ہے - یہ بات کس قدر دلچسپ ہے کہ اشتراکی ممالک (روس اور چین) میں نظریاتی وجوہ کی بنیاد پر اور نیشنلائزیشن کے نام پر زمین سے بیدخل کیا جاتا رہا ہے اور آزادی فرد کے علمبردار سرمایہ دار ملک میں یہی کام طریق پیداوار میں تبدیلی کی بنا پر سائنس اور ٹیکنالوجی ، سرمایہ اور مشینیں انجام دے رہی ہیں - زمین کے مالکانہ حقوق سے کاشتکار یہاں بھی بے دخل ہو رہا ہے اور وہاں بھی - نتائج کے اعتبار سے دونوں میں ہرگز کوئی فرق نہیں ہے - یہ الگ بات ہے کہ کہیں سیاسی نظریات اسے مالکانہ حقوق سے محروم کر رہے ہیں اور کہیں سائنس اور ٹیکنالوجی کا سرمایہ کارانہ رجحان اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا - زمین کی ملکیت کا تصوّر دونوں قسم کے ممالک سے معدوم ہوتا جا رہا ہے - مطلق تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا بھر میں زمینداروں کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور جاپان ، ڈنمارک اور نیدر لینڈ جیسے ممالک میں بھی جہاں زمینی ملکیتیں بہت چھوٹی ہیں اور زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ایسی ٹیکنالوجی پیدا کی گئی ہے جو چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں بھی زیادہ سے زیادہ پیداوار دینے کی صلاحیت رکھتی ہے ، یہی رجحان کارفرما ہے یعنی زمین سے کاشت کاروں کے اخراج اور انخلا کا عمل تیزی سے جاری ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمینی ملکیت کا تصوّر مختلف تاریخی قوتوں کے زیر اثر ناپید ہوتا جا رہا ہے - چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دنیا بھر کے زمیندار کاشت کاروں کی تعداد کم ہو رہی ہے[۳] اور زراعت پیشہ آبادی میں کمی کے ساتھ ساتھ زراعت میں سرمایہ کاری

کا رجحان بڑھ رہا ہے - مثال کے طور پر امریکہ میں ۱۹۶۰ء میں زرعی شعبہ میں فی کاشت کار ایک لاکھ روپیہ سرمایہ درکار ہوتا تھا جبکہ ۱۹۷۰ء میں یہ شرح بڑھ کر فی زرعی مزدور ڈھائی لاکھ روپیہ کو پہنچ چکی ہے -

زراعت میں سرمایہ کاری کی ضروریات صرف انہی ممالک میں نہیں بڑھ رہیں جہاں زرعی املاک بہت بڑی ہیں بلکہ ان ممالک میں بھی جہاں یہ املاک چھوٹی چھوٹی ہیں ، یہی رجحان کارفرما ہے مثلاً ڈنمارک کی زراعت میں ۵۰-۱۹۶۰ کے دوران میں زرعی مشینوں کی کل مالیت میں پچاس فیصد اضافہ ہوا اور اب بھی ان پر سالانہ سرمایہ کاری کی شرح چالیس فی صد کے حساب سے بڑھتی جا رہی ہے - اس طرح جاپان میں جہاں زراعت پیشہ آبادی روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے ، سرمایہ کاری کی ضروریات بتدریج بڑھ رہی ہیں - جاپان میں ۱۹۵۰ء میں کاشت کاروں کی تعداد ۴۷ فیصد تھی جب کہ ۱۹۶۷ء میں یہ تعداد کم ہو کر صرف ۲۳ فیصد رہ گئی اور اس پورے عرصے میں آٹھ لاکھ افراد ہر سال زرعی شعبہ سے صنعتی شعبہ میں منتقل ہوتے رہے لیکن مشینوں کی روز افزوں ترویج کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۵۰ء میں وہاں صرف بارہ ٹریکٹر تھے - ۱۹۶۰ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار ہزار تھی جبکہ ۱۹۶۳ء میں ان کی تعداد سترہ ہزار تک پہنچ گئی تھی - قطعاتِ اراضی چھوٹے چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہاں زراعت کا پیشہ اس قدر کم نفع بخش اور غیر اقتصادی ہو گیا ہے کہ کاشت کاروں کا انحصار زراعت پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے اور وہ زراعت کو صرف جزوقتی پیشہ کے طور پر اپنانے پر مجبور ہیں - ۱۹۷۶ء میں قریباً اسّی فیصد زراعت پیشہ خاندان زراعت کو صرف جزوقتی پیشہ کے طور پر ہی اپنائے ہوئے تھے اور ان کی آمدنی کا ۵۰ فیصد غیر زرعی شعبوں سے حاصل ہوتا تھا[۳] -

ہمارے زرعی مسائل

زراعت میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمل دخل کے اثرات اور جدید طرز کی زراعت میں سرمایہ کاری کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد ہم اصل زیر بحث مسئلہ کی طرف لوٹتے ہیں ۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے اور اس کی معیشت میں زراعت کی مرکزی حیثیت سے انکار نہیں ۔ زراعت کو ترقی دے کر ہی ملکی معیشت کو مضبوط بنایا جا سکتا ہے ۔ یہ حقیقت بھی محتاج بیان نہیں کہ یہاں انسانی آبادی روز افزوں اور زمین کا رقبہ محدود ہے ۔ صرف ایک سال ہی میں پاکستان کی آبادی میں ناروے کی مجموعی آبادی کے برابر اضافہ ہو جاتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں پاکستان ہر سال ایک چھوٹی سی قوم کو جنم دیتا ہے ۔ ظاہر ہے بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریاتِ خوراک و پوشاک بھی مسلسل بڑھ رہی ہیں ۔ زمینی وسائل محدود ہونے کی مجبوری کے ساتھ زرعی پیداوار کو بڑھانے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے پورا پورا استفادہ کیا جائے لیکن زراعت میں سائنس اور تکنیکی تبدیلیوں کی وجہ سے اس پیشے میں سرمایہ کاری کی ضروریات روز افزوں ہیں جن کی وجہ سے عام کاشت کاروں کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنے چھوٹے قطعات اراضی پر مناسب سرمایہ کاری کر کے اپنی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کر سکیں ۔ مثال کے طور پر گندم ، چاول ، مکئی کی نئی اقسام جو اس ملک کی زراعت میں ''تبدیلی کے انجن (Engines of Change)'' ثابت ہو رہی ہیں اپنے ہمراہ سرمایہ کاری کے متعدد رجحانات لاتی ہیں ۔ ان کی کامیاب کاشت کے لیے پانی زیادہ ، کھادیں زیادہ ، حشرات کش ادویہ کا استعمال اور کسی حد تک مشینی طریق کاشت کا اپنانا ناگزیر ہے اور یہ تمام چیزیں سرمایہ طلب ہیں ۔ درحقیقت سائنس اور تکنیکی طرز زراعت ایک صنعتی کاروبار ہے جس میں مناسب سرمایہ کاری کے بغیر کامیابی محال ہے ۔ مثلاً گندم ہی کو

لیجئے سابق صوبہ مغربی پا کستان میں گندم کی میکسیکن اقسام ۱۹۶۵ء میں رائج ہوئیں، محکمہ زراعت مغربی پا کستان کے شعبہ مارکیٹنگ اور زرعی اقتصادیات کے ۱۹۷۰ء کے ایک اندازے کے مطابق دیسی گندم کاشت کرنے کی صورت میں فی ایکڑ ۳۱۴ روپے لاگت اور ۳۸۶ روپے آمدنی ہوتی ہے جبکہ گندم کی نئی اقسام میکسی پاک کاشت کرنے سے ۴۳۲ روپے لاگت اور ۷۰۲ روپے آمدن اٹھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص فی ایکڑ معمولی سے اخراجات سو سوا سو زیادہ کرنے کے قابل ہے وہ تو ۲۶۹ روپے منافع کماتا ہے لیکن جو استطاعت نہیں رکھتا اس کی آمدنی ۶۷ روپے سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور وہ محض اپنی غربت کی مجبوری سے دو سو روپے کے زائد منافع سے محروم رہ جاتا ہے۔ یعنی ایک متمول کاشت کار صرف سو سوا سو روپیہ فی ایکڑ زائد خرچ کر کے ۶۲ فیصد منافع کماتا ہے۔ لیکن ایک غریب کاشتکار ۲۱ فیصد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غرض یہ کہ نئی تکنیکی تبدیلیاں سرمایہ طلب ہونے کی وجہ سے پہلے پہل صرف متمول کاشتکاروں ہی کی دسترس میں آتی ہیں اور وہ انھیں اپنانے میں سبقت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر نئی تکنیکی تبدیلی کی اقتصادی نفع بخشی سے اس وقت تک مستفید ہوتے رہتے ہیں تاآنکہ ان کے عام ہو جانے سے پیداوار میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں۔ اس وقت قلیل الوسائل کاشتکار جو اپنی کم علمی یا قلّت سرمایہ کی وجہ سے اس نئی تکنیکی تبدیلی کو اپنانے سے قاصر ہیں۔ دوہرے خسارے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یعنی تکنیکی تبدیلی سے استفادہ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ پیداوار کو تو بڑھا نہیں سکتے لیکن جب ملک کی مجموعی پیداوار میں اضافے کی وجہ سے قیمتیں گرنے لگتی ہیں تو اس کا نقصان انھیں ضرور پہنچتا ہے۔ اس ساری بحث کو ایک جملے میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے کہ نئی ٹیکنالوجی نے زراعت میں سرمایہ کاری کو فروغ دے کر امیر کاشتکاروں کو امیر تر اور غریب کاشتکاروں

کو غریب تر بنا دیتی ہے چنانچہ نئی ٹیکنالوجی کے انھی مضمرات کے پیشِ نظر اقوام متحدہ کے ایک سابق سیکریٹری جنرل اوتھان نے ایک بار دنیا کو متنبہ کیا تھا کہ پاکستان ، ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک میں جس سبز انقلاب کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے خطرہ ہے کہیں وہ سرخ انقلاب میں تبدیل نہ ہو جائے[۵] ۔

زراعت کے صنعت بن جانے سے زرعی شعبے میں بھی معاشی انصاف کا مسئلہ شدّت سے اُبھر آیا ہے ۔ جب تک زرعی پیداواری طریقوں میں زمین ، انسانی محنت اور توجہ کے عوامل کارفر رہے اور زراعت میں تمام کام انسان کی شخصی توجہ اور محنت کے محتاج رہے جذبہ ملکیتِ زمین کو برقرار رکھنا اور اسے قانونی تحفّظات دینا نہایت ضروری تھا ۔ لیکن آج کے سائنسی دور میں جب کہ زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے کھیت میں انسانی محنت کی جگہ فولادی محنت یعنی ٹریکٹر اور انسانی ذہن کی جگہ مشینی ذہن یعنی کمپیوٹر لے رہے ہیں اور انسان زمین سے کہیں دُور پیچھے کی طرف سرکتا رہا ہے ۔ ملکیتِ زمین پر اصرار زرعی ترقی کے لیے زنجیرِ پا بن گیا ہے ۔ کیونکہ اس صورت میں چھوٹے چھوٹے قطعات پر زراعت کو صنعتی بنیادوں پر قائم کرنے کی گنجائش نہیں رہتی ۔ دوسری طرف جب زراعت کو صنعتی طرز پر منظّم کیا جاتا ہے ۔ تو معاشی انصاف کا مسئلہ وبالِ جان بن جاتا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ زراعت کی نئی تنظیم میں اَن دونوں مقاصد میں باہم تطبیق اور ہم آہنگی کیونکر پیدا کی جائے ۔

زراعت کی تنظیمِ نو کا ایک طریقہ تو وہ ہے جو اشتراکی ممالک نے اختیار کیا ہے یعنی زمین کو قومی ملکیت قرار دینے کا انقلابی اقدام ۔ لیکن جمہوری ممالک میں جہاں زراعت کو معاشی قوانین کے قدرتی عمل پر چھوڑ دیا جاتا ہے زرعی تنظیم ارتقائی طور پر ایک

طویل عرصے میں تدریجاً تکمیل پاتی رہتی ہے - تیسری صورت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکار برضا و رغبت چھوٹے چھوٹے قطعات کو یکجا کر کے اسلامی اصولوں پر کوآپریٹیو فارمنگ کو ترجیح دیں - کواپریٹیو فارمنگ کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارا کاشت کار ملکیت کے تصوّر سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں - زمین سے کاشتکاروں کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ کومیلا (بنگلہ دیش) میں ٹریکٹروں کے استعمال کو مقبول بنانے کے لیے ۱۹۶۰ء میں کوآپریٹیو تحریک کا جو تجربہ کیا گیا اس کے لیے یہ صورت اختیار کی گئی کہ چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں کو یقین دلایا جاتا تھا کہ ان کی ملکیت سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا - اس کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ ٹریکٹر چلانے سے پہلے چوبی میخیں گاڑ کر اپنے اپنے کھیتوں کی حد بندی کی نشاندہی کر لیتے تھے اور ٹریکٹر چلانے کے بعد از سر نو اپنے کھیتوں کی وٹیں دوبارہ قائم کر لیتے - یہ تجربہ اتنا نرالا اور انوکھا تھا کہ اس کا چرچا پوری دنیا میں ہوا - لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس تجربے کی کامیابی کو کامیابی شمار کرنا ہی غلطی ہے - کیونکہ اس میں کوآپریٹیو فارمنگ سے راستے کی اصل رکاوٹ (یعنی ملکیت زمین کا ایسا تصوّر جو زمین سے معاشی ضروریات پوری کرنے کے بجائے زمین پیوندی پر مبنی ہو) کو دور نہیں کیا گیا - اس رکاوٹ کو دور کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ زمین کے "متاع" ہونے کی قرآنی تصوّر کو عام کرنے کے لیے ایک زبردست تعلیمی تحریک چلائی جائے اور کاروبار زراعت کے کوآپریٹیو اداروں میں اپنی اپنی ملکیت کو بطور حصص رکھنے کے خیال کو مقبول بنایا جائے - کاشتکاروں پر یہ بات واضح کرنے کی سخت ضرورت ہے کہ جدید زراعت میں سرمایہ کی روز افزوں احتیاج کاشتکاری کو انفرادی پیشہ کی حیثیت سے ختم کر رہی ہے - اس لیے انھیں رضا کارانہ طور پر

امداد باہمی کے اسلامی اصولوں پر ایسے ادارے اور تنظیمیں قائم کرنی چاہئیں جن سے زراعت کو زیادہ سے زیادہ پیداواری بنایا جا سکے۔

امداد باہمی کے اصولوں پر زرعی انجمنوں کا قیام اور اجتماعی خطوط پر کھیتی باڑی کی تنظیم مسلمانوں کے لیے کوئی نیا خیال نہیں۔ اس کے نظائر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائے۔ جس وقت آپ نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اس وقت مدینہ منورہ کے ارد گرد سب کی سب زرعی آبادیاں تھیں۔ اس لیے آپ نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی زرعی آبادیوں کو از سرِ نو منظّم کیا۔ مردم شماری کرائی اور مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات قائم کر کے اراضی کو اس طرح تقسیم فرمایا کہ مہاجرین انصار مشترکہ طور پر کاشت کاری کریں۔ اشتراکی صورت یہ تھی کہ ایک ایک انصاری کا گروپ تشکیل دے کر ایک ایک یونٹ اراضی ان کی تحویل میں دے دی گئی۔ جس کا نام شاملہ رکھا گیا۔ شاملہ پر کھیتی باڑی کا کام باری باری سے انجام پاتا تھا۔ جس کی رو سے ایک روز مہاجر زمین پر کام کرتا اور انصاری تعلیم حاصل کرتا یا دوسرے دینی کام انجام دیتا اور دوسرے روز انصاری کھیتی باڑی کرتا اور انصاری تعلیم حاصل کرتا اور مہاجر دوسرے کام سر انجام دیتا۔ مثلاً کنواں کھودنا، بند باندھنا وغیرہ۔ علاوہ ازیں آپ نے بڑے بڑے زرعی منصوبوں کے لیے علاقہ کے نام سے زرعی تنظیمیں قائم کیں جو امداد باہمی کے اصولوں پر کام کرتی تھیں اور اس نقشہ پر پورا نظام ملکیت نقابت، عرافت، نظارت اور عمالت میں درجہ وار تقسیم فرمایا[۶]۔

اسلام اور متاع کا حرکی تصور

غرض یہ کہ اسلام میں زمین کے بارے میں ملکیت کا کوئی جامد تصوّر نہیں پایا جاتا بلکہ ''متاع'' کا حرکی تصوّر ملتا ہے۔ جو

ہر دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو بخوبی پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ اس انتہائی اہم نکتہ کی وضاحت علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کا ایک دلپسند موضوع تھا جس پر آپ نے بار بار زور دیا ہے ۔ مولوی محمد تقی امینی اپنی کتاب ''اسلام کا زرعی نظام'' کے آخر میں لکھتے ہیں ۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے کرام کے زمانہ میں حقِ ملکیت کی حیثیت حقِ استعمال اور حقِ انتفاع سے زیادہ نہ تھی اور مفادِ عامہ کی خلاف ورزی کی صورت میں انفرادی حق پائمال کیے بغیر خلافت کو ہر قسم کے صرف کا اختیار حاصل تھا ۔ اس میں حقوق ملکیت کا ''گورکھ دھندا'' حائل ہوتا نہ کچھ اور''>

موجودہ زمانے میں زراعت ایک نہائت ہی پیچیدہ اور متغیر معاشی عمل ہے جس کے موثرات اور عوامل کے بیان میں زمین کی ذرخیزی سے لے کر کسان کے ذہن کی ذرخیزی تک ایک ایک بات کا تذکرہ درکار ہے ۔ اقتصادیات کے ایک بہت بڑے ماہر شلٹز (Theodre Schultz) قول ہے کہ کسی ملک کو جدید ترین سٹیل مل لگانے کا طریقہ بتلانا بہت سہل ہے لیکن زرعی ترقی کے بارے میں صحیح مشورہ دینا سخت مشکل ہے کیونکہ یہاں تو ''ز ہجر تا بہ وصالش ہزار فرسنگ است'' والا معاملہ ہے ۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ سڑک کی تعمیر سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے تو شاید یقین نہ کیا جائے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ تھائی لینڈ میں شاہراہ دوستی (Friendship Highway) نامی ایک سو میل لمبی سڑک کی تعمیر سے صرف تین سال کے مختصر عرصہ میں وہاں گنّا ، کیلا اور دوسرے پھلوں کی پیداوار تین گنا بڑھ گئی اور تھائی لینڈ نے جاپان کو مکئی کی فاضل پیداوار برآمد کرنی شروع کر دی ۔ زرعی اقتصادیات کے ماہرین نے مختلف ممالک کی زرعی ترقی کا تجزیہ کرنے کے بعد زراعت کی ترقی کے جو اجزائے ترکیبی گنوائے ہیں ان کی اہمیت مختلف ممالک کے لیے مختلف ہے ۔ زراعت کے

پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ بعض ادارتی تغیّرات (Institutional Changes) (مثلاً زمین اور کسان کے قانونی رشتوں میں تبدیلی) ناگزیر ہو گئے ہیں - جس کے لیے کسان کے ذہن کو تبدیل کرنا درکار ہے - چنانچہ کسان کی ''ذہنی ذرخیزی'' کے لیے جس قسم کی ذہنی کھاد درکار ہے اس میں فنی معلومات (Technical Information) اور تحریک (Motivation) دونوں شامل ہیں[۸] - اس بات پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کہ پیداواری طریقوں کی تبدیلی کاشتکار کی ذہنی تبدیلی کی مقتضی ہے لیکن ذہنیت کی تبدیلی بسا اوقات نظریہ حیات کی تبدیلی پر بھی منتج ہو سکتی ہے مثال کے طور پر اس صدی کے شروع میں جاپان میں مغربی سائنس سے استفادہ کرنے کے لیے ''مغربی ٹیکنالوجی اور مشرقی اقدار'' کا نعرہ لگایا گیا لیکن جب مغربی ٹیکنالوجی نے وہاں پوری طرح قدم جما لیئے تو منکشف ہوا کہ وہاں مغربی اقدار حیات بھی ترویج پا چکی ہیں - چنانچہ جاپان کے قومی ناول نگار سو سیکی ناشو ما (Soseki Natsuma) نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا - اس کے ناولوں کا مرکزی فکر یہ ہے کہ جاپان نے جدیدیت کو عجلت سے اپنایا اور اس کے نتیجے میں ایک ایسا انتہائی سطح میں معاشرہ معرض وجود میں آیا جس کی بنیاد ہی دھوکے پر ہے[۹] -

جدید ٹیکنالوجی کے نفوذ سے زراعت کے پیداواری طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں کھیت کی حد بندی میں وسعت پذیری اور وسعت طلبی کی مقتضی ہیں اور ان کی وجہ سے زمین اور کسان کا قانونی رشتہ یعنی تصوّرِ ملکیت (جو در حقیقت اس کے معاشی مفادات کے تحفّظ کی ایک تدبیر کے طور پر پیدا ہوا تھا) متاثر ہو رہا ہے - نیز زراعت میں سرمایہ کاری کی روز افزوں ضروریات امیر کاشتکاروں کو امیر اور غریب کاشتکاروں کو غریب تر بنائے جا رہی ہیں - ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ زمین کی پیداوار میں اضافہ ہو - معاشرہ میں معاشی

انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور فرد کو ایسی آزادی حاصل رہے کہ وہ اخلاقی جدوجہد میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے سکے ۔ ان سہ گونہ مقاصد کے حصول میں زمین کو قومی ملکیت قرار دینا ، ممکن ہے کہ مسئلہ کا اقتصادی حل ہو لیکن انسانی اور اخلاقی حل ہرگز نہیں ہے ۔ نیز بڑا خطرہ اس حل کے اپنانے میں یہ ہے کہ اس کے واسطے سے ایک ایسے نظریۂ حیات کو یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا جسے آپ جو نام دینا چاہیں دے لیں لیکن اسلام ہرگز نہیں کہہ سکتے ۔ اس لیے علامہ اقبال جن کے فکر کا سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام ہے ایسے اقدام کے داعی اور موید نہیں ہو سکتے تھے ۔ آج کل بعض حلقوں کی طرف سے جو کہا جا رہا ہے کہ علامہ اقبال زمین کو قومی ملکیت میں دینے کے زبردست داعی تھے صرف کذب و افترا ہے بلکہ ان کی بنیادی فکر کے منافی ہے ۔ در حقیقت علامہ اقبال کے بارے میں یہ غلطی دو وجہ سے پیدا ہوئی ایک تو یہ ہے کہ آپ نے دہقان کی مظلومیت سے متاثر ہو کر سخت تند و تیز شعار کہتے ہیں ۔ جن کی اثر انگیزی اور جذباتی تحریک سے ناجائز سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ دوسرے یہ ہے کہ آپ نے زمین کے سلسلے میں ملکیت کے تصوّر پر زور دیا ہے لیکن زمین کے تصوّرِ متاع پر علامہ اقبال کے اصرار کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انفرادی ملکیت کے تصوّر کی نفی کر کے قومی ملکیت کے تصوّر کو اپنا لیا جائے ۔ نہ ہی الارض للہ کا یہ مطلب ہے کہ ”زمین حکومت کی ملکیت ہے“ اللہ کے معنی حکومت نہیں ہیں البتہ جو حکومت اللہ کی مرضی کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کرے اسے مفاد عامہ میں زمین کے بارے میں ہر قسم کے تصرف کا حق ہو گا ۔

جس طرح پانی ، ہوا اور روشنی کے وسائل جن پر پوری انسانیت کی بقا کا انحصار ہے کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتے اسی

طرح زمین بھی خوراک پیدا کرنے کا ذریعہ ہونے کے اعتبار سے کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی ۔ تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں جب انسان اپنی خوراک جنگل کے پھلوں سے حاصل کرتا تھا تمام زمین، ''آب و نان ماست از یک مائدہ'' کے مصداق انسانوں کی مشترکہ ملکیت تھی ۔ زراعت کی ایجاد نے انفرادی ملکیت کی احتیاج پیدا کی تاکہ کوئی طاقتور شخص کسی کمزور شخص کو محض قوت کے بل بوتے پر بیدخل کر کے اس ذریعہ رزق کو چھین نہ سکے ۔ چنانچہ ابتداً حقِ ملکیت حقِ تمتع کو تحفّظ دینے کے لیے پیدا ہوا اور اسے قانونی حیثیت دی گئی ۔ لیکن رفتہ رفتہ اس ملکیت کی نوعیت بدلتی گئی اور یہ حقِ مستقل ملکیت کے ایسے جامد تصور میں تبدیل ہو گیا کہ ''زمین جنبدَ نہ جنبد گل محمد'' اب تمتع اور انتفاع کے بجائے زمین پیوندی پر مبنی قبضہ اور اختیار کو بنیادی اہمیت حاصل ہو گئی اور ایسا تصورِ ملکیت معرض وجود میں آیا جس کی رو سے ایک جاگیردار کو یہ حق ملا کہ وہ جتنی اراضی چاہے اپنے قبضے میں رکھے خواہ وہ اسے استعمال میں نہ لاتا ہو اور اس سے خواہ کتنے ہی لوگوں کی روزی کیوں نہ متاثر ہوتی ہو ۔ حالانکہ زمین ایک ایسا قدرتی وسیلہ ہے جس سے تمام انسانوں کی غذائی ضروریات پوری ہونی چاہئیں ۔ علامہ اقبال جب زمین کے بارے میں فرماتے ہیں ۔

ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

یا

باطن الارض للہ ظاہر است
ہر کہ این ظاہر نہ بیند کافر است[۱۰]

تو وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں ۔

دو گونہ مشکلات

موجودہ زمانے میں اس مسئلہ نے ایک پیچیدگی اختیار کر لی ہے ایک طرف تو جاگیردار ہیں جو وسیع و عریض اراضیات کو محض قوت کی علامت کے طور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے ہیں اور اس وسیلہ رزق پر قابض رہ کر مفادِ عامہ کے راستے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے کاشتکار ہیں جو زمین سے پوری پیداوار حاصل کرنے پر قادر نہ ہونے کے باوجود کھیتوں کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور ان حد بندیوں میں کسی قسم کی تبدیلی کو ظلم سمجھتے ہیں ۔ حالانکہ یہی حد بندی ان کے لیے غربت کا قید خانہ بنی ہوئی ہے ۔ ان دونوں برائیوں کا انسداد صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ زمین کے بارے میں ملکیت کے تصوّر کو چھوڑ کر متاع کے تصوّر کو اپنایا جائے اور اس تبدیلی کو لانے کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ آخرت کے حوالے سے ملکیت کی نفی کی جائے اور توحید کے حوالے سے پوری نوع انسانیت کو ''دودۂ آدم کنفس واحدہ'' سمجھ کر ان کی ضرورت رزق کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کیا جائے ۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ اس ذمہ داری کے پیشِ نظر لوگ کبھی خود اپنی زمینیں خلافت کے حوالے کر دیتے تھے اور کبھی خلافت ان سے لے لیتی تھی کیونکہ وہ زمین کے بارے میں ''این متاع بندہ و ملک خدا ست'' کا نظریہ رکھتے تھے ۔

تصورِ ملکیت اور متاع کا فرق

''ملکیت'' اور ''متاع'' کے تصور میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ملکیت کا تصوّر ہمیں ایک جامد قسم کے فلسفہ میں اُلجھا دیتا ہے جبکہ ''متاع'' کے تصوّر سے ہمیں ایک محرک فلسفۂ حیات ملتا ہے ۔ جس میں مطلوبہ ادارتی تبدیلیوں (Institutional Changes) کے لیے

ہمیشہ گنجائش باقی رہتی ہے - چنانچہ اس تصور کو اپنی زرعی پالیسی کی بنیاد بنا کر ہم نہ صرف اپنی فنی ، معاشی ، معاشرتی اور سیاسی مشکلات دور کر سکتے ہیں بلکہ عصر کے جدید زرعی تقاضوں کو بآسانی اور بخوبی پورا کرنے کی واحد صورت بھی یہی ہے -

متاع کا حرکی تصور ہمارے فکر و عمل کے لیے ایک وسیع دائرہ کھلا چھوڑتا ہے جس میں ہمیں اپنے نظریۂ حیات کی روشنی میں خود اپنی راہ تلاش کرنی چاہیے - دوسروں کی نقالی سے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے -

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہ دیگراں رفتن عذاب است

باب پنجم

کھیت ـــــ خودی کی تربیت گاہ

اسلامی نقطۂ نظر سے زرعی نظام کی تشکیل میں چند ایسے اصولوں پر ہی عمل پیرا ہونا کافی نہیں ، جن سے پیداوار میں اضافے کے اقتصادی تقاضے پورے ہوتے ہوں بلکہ ان اعلیٰ ملّی مقاصد اور انفرادی اقدار کو پیشِ نگاہ رکھنا بھی ضروری ہے جو انسانی زندگی کی آخری غائت ہیں اور جو دوسرے ادیانِ عالم کے مقابلے میں دین اسلام کا مابہ الامتیاز ہیں ۔ علامہ اقبال کے نزدیک دنیائے انسانیت کو اس زمانے میں تین چیزوں کی ضرورت ہے ۔ ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' میں وہ رقمطراز ہیں ۔

''عالمِ انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے ۔ کائنات کی روحانی تعبیر ، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا رہے''' ۔

اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال اس بات کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں کہ ذریعہ روزگار یا پیشہ انسان کو روحانی اعتبار سے بھی متاثر کرتا ہے ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ۔ ''اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں اصولِ مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں مگر یہ بات بھی روزمرّہ کے تجربے اور مشاہدے

سے ثابت ہوئی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے"[۲]۔

اقتصادیات اور اخلاقیات

انسانی معاشرے کو روحانی اساس پر استوار کرنے کے ضمن میں وہ اقتصادی پالیسی کو اخلاقی مقاصد کے تابع رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ "علم الاقتصاد" میں وہ لکھتے ہیں :

"انسان کے معمولی مقاصد کو سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی لحاظ سے نظر ڈالنی چاہیے ۔ مثلاً خوراک ، لباس اور مکان ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں ۔ مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصل وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے ۔ جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقاصد کے لحاظ سے غور کریں ۔ اس لیے علم الاقتصاد سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ اور علم اخلاق کا ہونا بھی ضروری ہے ۔ اکثر مصنّفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقاصد کے بجائے خود ایک مقصد بن گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت سے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے تیز ہو گئی"[۳]۔

علامہ اقبال آگے چل کر لکھتے ہیں :

"موجودہ دور کے محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے ۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کے

سیاسی اور اقتصادی نظام تمام اجزا سے ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں ۔ علیٰ ہٰذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر بُرا اثر ڈالتی ہیں اور پیدائشِ دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں"[۴] ۔

غرض ان کے نزدیک دولت کو اقتصادیات اور اخلاقیات کے تابع رکھنا ضروری ہے تو دوسری طرف اس بات کے بھی شدّت سے قائل ہیں کہ اخلاقی تربیت کے بغیر اقتصادی ترقی کی جانب ایک قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا ۔ "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں فرماتے ہیں :

"اقتصادی مقابلے میں تربیت کے اخلاقی عنصر کی ضرورت کچھ کم نہیں پڑتی ۔ اعتمادِ باہمی ، دیانتداری ، پابندیٔ اوقات اور تعاون وہ اخلاقی اوصاف ہیں جو مہارتِ فن کی برابر کی جوڑ ہیں ۔ ہندوستان میں بہت سے کارخانے محض اس لیے نہ چل سکے کہ کارخانہ داروں کو ایک دوسرے پر بھروسہ تھا نہ اصول امداد باہمی رہنما تھا ۔ اگر ہم اچھے کاریگر ، اچھے دکاندار ، اچھے اہلِ حرفہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اچھے شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ انہیں اوّل پکا مسلمان بنائیں"[۵] ۔

نصب العین کا تعین

علامہ اقبال کے ان خیالات کے پیشِ نظر کسی بھی قومی (بالخصوص اقتصادی) پالیسی کو وضع کرنے کے ضمن میں پہلے مدعا کا تعین ضروری ہے ۔ کیونکہ اس سے قوائے زندگی جمع ہو کر بقائے زندگی کا موجب بنتے ہیں اور یہ مدعا ہی ہے جو افرادِ قوم کی ہمّت کو جوان بناتا ہے ۔ "رموزِ بے خودی" میں آپ نے ایک باب کا عنوان یہ رکھا ہے ۔

"در معنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ و نصب العین امت محمدیہ حفظ و نشرِ توحید است" ۔

اس کے مندرجہ ذیل اشعار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

مدعا گردد اگر مہمیز ما
ہم چو صرصر می رود شب دیز ما

مدعا رازِ بقائے زندگی
جمع سیماب قوائے زندگی

چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطہ اسباب ایں عالم شود

مدعا مضراب سازِ ہمت است
مرکز کو جاذب ہر قوت است[۶]

حفظ و نشر توحید

اور وہ مدعا کیا ہے ؟ اقبال کے نزدیک یہ مدعا روحانی اساس پر انسانی معاشرے کا ارتقاء یا دوسرے الفاظ میں "حفظ و نشرِ توحید" ہے ۔

تخم ایمان آخر اندر گل نشاند باز بانت کلمۂ توحید خواند
نقطۂ او را عالم لا الہ انتہائے کار عالم لالہ

زاں کہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشرِ لا الہ مقصود تست[۷]

حفظ خودی

اور انفرادی سطح پر "خودی" انسانی زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے جس کے لیے وہ "دل" یا کسان کو سمجھانے کے لیے

''دانۂ دل'' کی شاعرانہ ترکیب استعمال کرتے ہیں -

اللہ تعالٰی نے جہاں اپنی خلاقیت ، ربوبیت اور رزاقیت کی تقسیم کے لیے زراعت سے بے شمار زرعی استعارے اور تشبیہات استعمال کر کے انسان کو زندگی کے اعلٰی مقاصد کی طرف متوجہ فرمایا ہے - وہاں دیہاتی آبادی کے بارے میں یہ اندیشہ بھی ظاہر فرمایا ہے کہ ان میں کفر و نفاق کی طرف مائل ہونے کے امکانات زیادہ ہیں - ''یہ اعراب کفر و نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول صلعم پر نازل کیا ہے''[۸]-

اس قرآنی حکمت کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زراعت کو ''باعثِ ذلت'' فرمایا تھا -

حضرت ابو امامہؓ نے ایک جگہ ہل اور کھیتی کے آلات دیکھ کر فرمایا ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس گھر میں یہ آلات داخل ہو جاتے ہیں اس گھر میں اللہ ذلت و مسکنت داخل کر دیتا ہے'' -

مولانا حفظ الرحمٰن سیلوہاوری نے اپنی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' میں اس حدیث کی توجیہہ کے سلسلے میں امام محمدؒ ، امام سرخسیؒ ، شاہ ولی اللہؒ ، امام ابن حزمؒ ، امام بخاریؒ ، محدث داؤدیؒ اور محدث ابن تینؒ کی آراء بیان کی ہیں ، جن میں مؤخر الذکر کے سوا تمام علماء و فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اس حدیث سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت پیشہ زراعت کی تنقیص فرمائی بلکہ آپ نے اس پیشے کے ان مضر نفسیاتی اثرات کو ذلت و رسوائی سے تعبیر فرمایا ہے جس کی وجہ سے وہ دین کے اعلٰی مقاصد مثلاً ''جہاد'' (یعنی حفظ و

نشر توحید) سے بھی غافل ہو جاتا ہے ۔ کسان کی زندگی کے لیل و نہار بیلوں کی دُم کے پیچھے پیچھے پھرنے ، گوڈنے ، پانی دینے ، بیج بونے اور فصلوں کو نشو و نما دینے میں گزر جاتے ہیں جو بسا اوقات اس میں زمین پیوندی ، رجعت پسندی ، محدود مفادات ، محدود وفاداریاں جیسے خصائلِ شنیعہ پیدا کر دیتی ہیں[٩] ۔

''پنجاب کے دہقان سے خطاب'' میں علامہ اقبال فرماتے ہیں :

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز
ہزاروں برس سے ہے تو خاک باز

اسی خاک میں دب گئی تیری آگ
سحر کی اذان ہو گئی اب تو جاگ

بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ

زمین میں ہے گو خاکیوں کی برات
نہیں اس اندھیرے میں آبِ حیات

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں[١٠]

چنانچہ کسان کو جو ایک دانہ بو کر صد ہزار دانے پیدا کرنے میں یقین رکھتا ہے ، یہ مشورہ دیتے ہیں کہ زندگی کا مقصد یہی نہیں کہ تم زمین ہی میں دانہ ڈالنے پر قانع ہو کر رہ جاؤ بلکہ خاکِ بدن میں بھی دانۂ دل اُگانے کی فکر کرو ۔

بخاک بدن دانۂ دل فشاں
کہ این دانہ دارد ز حاصل نشاں[١١]

''اقبال کے حضور'' میں سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ زمین پیوستگی کے بجائے زمین وارستگی (اپنے تمام اخلاقی ، روحانی ، سیاسی ، اجتماعی متضمنات کے ساتھ) حضرت علامہ کا خاص مضمون ہے چنانچہ حضرت علامہ انسان کے اس جذبے کو بہت اہمیت دیتے ہیں جو روحِ انسانی کو زمین سے رستگاری حاصل کرنے اور عالمِ بالا کی سیر کرنے پر آکساتا ہے ۔ ان کے نزدیک زمین سے آزاد ہونا انسان کا بنیادی امتیازی وصف ہے اور انسان کو زمین سے آزاد ہونا چاہیئے[۱۲]۔

یہ جذبہ انسانی شخصیت کے ماورائی پہلو سے تعلق رکھتا ہے اور ذات باری تعالیٰ سے جو لامکان ہے تعلق بلکہ شدید محبت پیدا کر کے ہی تشفی پا سکتا ہے ۔ چنانچہ علامہ اقبال کے نزدیک خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ ہے ۔ اس لیے حفظِ خودی کا تقاضا بھی حفظ و نشرِ توحید ہی ہے جو اُمتِ محمدیہ کا نصب العین ہے ۔ اس لیے علامہ اقبال کسان کو خودی کی نگہبانی اور تربیت کا درس دیتے ہیں ۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو[۱۳]

ڈھونڈھ کے اپنی خاک میں پایا جس نے اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان[۱۴]

خودی کی نشو و نما عشق و محبت سے ہوتی ہے اور عشق و محبت کا محور و مقصد خدا کی ذات ہی کو ہونا چاہیے کیونکہ خودی کی نشو و نما کے لامحدود امکانات اللہ کی محبت ہی سے آجاگر ہوتے ہیں ۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائیندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

از محبت اشتعالِ جوہرش
ارتقائے ممکنات مضمرش[۱۵]

''دانۂ دل'' کی اصطلاح سے بھی علامہ اقبال کی مراد ایسی خودی ہے جو خدا کی محبت سے بالیدگی اور نشو و نما پائے ۔ کاشت کار اپنے پیشے میں قدم قدم پر خدا کی صفات ، ربوبیت ، خلاقیت اور رزاقیت کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے ۔ کھیتی باڑی کے تمام کام اور کسان کی زندگی کے داخلی اور خارجی احوال اسے اپنے خدا کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کرنے کی تحریک کرتے رہتے ہیں ۔

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون ؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب ؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار ؟
خاک یہ کس کی ہے ؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب ؟
کس نے بھردی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب ؟[۱۶]
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب ؟

غرض جب کسان یہ دیکھتا ہے کہ وہ خدا ہی کی ذات ہے جو بیج کو مٹی کی تاریکی سے پالتی ، دریاؤں سے سحاب اٹھاتی ، نور آفتاب سے فصلوں کی بالیدگی کا سامان کرتی ، موسموں کو خوئے انقلاب سکھاتی اور بالآخر خوشۂ گندم کی جیب کو موتیوں جیسے دانوں سے معمور کر دیتی ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ زمین اور یہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے ۔

دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں[۱۷]

چنانچہ اس بصیرت کی روشنی میں کسان زمین کے ساتھ خدا کے واسطے سے ایک نیا رشتہ دریافت کرتا ہے اور اس پر منکشف ہو جاتا ہے کہ زمین کا حقیقی مالک نہ جاگیردار ہے اور نہ مزارع اور نہ ہی کاشتکار - زمین کے ساتھ انسان کے ان عارضی اور ناپائیدار رشتوں سے بلند تر ہو کر جب وہ الارض اللہ کی حکیمانہ بصیرت حاصل کر لیتا ہے تو اسے اپنے لیے خلیفۃ الارض کا وہ مقام نظر آنے لگتا ہے جہاں پہنچ کر رمزِ محبت میں وہ بکمال شوخی اپنے خدا سے کہہ سکتا ہے -

بیاباں و کوہسار و راغ آفریدی
خیاباں و گلزار و باغ آفریدم[۱۸]

اور جہاں زمین اسے یہ پکارتی ہوئی سنائی دیتی ہے -

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ[۱۹]

انّی جاعل فی الارض خلیفہ کی قرآنی بصیرت میں یہ حقیقت خود بخود اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ جہاں اس کرۂ ارض کی تمام مخلوقات کو محض تلاش کرنے پر ہی اپنا رزق مل جاتا ہے وہاں انسان پر اپنا رزق خود پیدا کرنے کی ذمہ داری ڈال دینے میں کیا حکمتِ خداوندی تھی ؟ درحقیقت زمین پر انسان کو قادر و قابض بنانے کی یہی عملی صورت تھی جو ممکن ہو سکتی تھی - اس اعتبار سے دیکھا جائے تو کسان کو اللہ تعالٰی کے نظامِ ربوبیت یعنی انتظامِ رزق رسانی میں ایک نہایت ہی اہم مقام ملا ہے - جس کا تقاضا

یہ ہے کہ وہ تمام مخلوق کو کنبۂ خدا سمجھتے ہوئے ان کی ضروریات رزق پیدا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیکن جو کسان کھیت سے خود اپنا بھی رزق نہ حاصل کر سکتا ہو وہ بھلا اپنے منصب اور اپنی خودی کو کس طرح پہچان پائے گا ۔ کھیت سے دہقان کو رزق نہ ملنے کی وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں اور یہ وجوہ انفرادی بھی ہو سکتی ہیں اور معاشرتی بھی ، معاشی بھی اور اخلاق بھی ، فنی اور تکنیکی بھی ، اقبال کے نزدیک قابلِ صد نفرین ہیں ۔ جس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے ۔ چنانچہ ''بالِ جبریل'' میں خدا اپنے فرشتوں سے کہتا ہے ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میّسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو[٢٠]

کسان کا مقدر تو یہ تھا کہ وہ اپنی خودی کو پرکھنے کا روحانی تجربہ حاصل کرتا ، وہ تو اپنی روٹی بھی پیدا کرنے سے عاجز رہا ، جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے چکر میں پھنسا رہا ''کاد الفقران یکون کفرا'' کے ارشاد نبوی ؐ کے مصداق خدا کی ربوبیت اور اپنی خودی سے ہی انکار کر بیٹھا ۔ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے ؟ اس طرح جو کاشتکار زمین سے بھرپور اقتصادی نفع کماتا ہے لیکن اپنے اس پیشے کو اپنی روحانی نشو و نما کا سامان نہیں بناتا اس کے خائب و خاسر ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے ۔ ''جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو اس کے لیے ہم اس کھیتی میں افزائش کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو تو اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصّہ نہ ہوگا''[٢١]۔

روحانی اساس کی ضرورت

کاشت کاری کے کام میں روحانیت اور عظمت و تکریم پیدا

کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس کو روحانی اساس مہیّا کی جائے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہوگا جب اس کام کا رشتہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جوڑا جائے گا ۔ انسان کی روحانی نشو و نما کے لیے لازم ہے کہ کاشت کار کی فکر کو ہمہ وقت بیدار رکھ کر خدا کی ذات کے ساتھ اس کا شعوری تعلق قائم رکھا جائے ۔ یوں نہیں ہونا چاہیے کہ محنت کش کاشت کار کی زندگی کے لمحات دو طرح کے خانوں میں بٹ جائیں جن میں کبھی تو وہ محوِ فکر ہو اور کبھی محوِ کار ۔ اپنی محنت اور مشقت کے دوران کاشت کار خدا کے ساتھ اپنا شعوری تعلق کیوں کر قائم رکھ سکتا ہے ، اس کی ایک نہایت برجستہ مثال سائمن ویل (Simone Weil) نے دی ہے ، جسے یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔ وہ رقمطراز ہے ۔

''اس میں شک نہیں کہ جب کوئی شخص مصروفِ کار ہوتا ہے تو اس وقت اس کی تمام توجہ اپنے کام پر ہی مرکوز ہوتی ہے ۔ مثلاً جب کوئی (تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ) کاشت کار زمین میں بیج بکھیر رہا ہوتا ہے تو اگرچہ اس کے پیشِ نظر یہی ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اچھی طرح بوائی کرے اور اس وقت وہ بیج کے بارے میں ان تمام سائنسی معلومات پر غور و خوض نہیں کر رہا ہوتا جو اس نے اپنی زرعی تعلیم کے دوران حاصل کی ہیں ۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت جو عمل اس کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے ، وہ اس کی تمام فکر پر محیط ہے ۔

اس کی مثال یوں سمجھئیے کہ ایک مسرور نوجوان بیاہتا عورت کو اپنے پہلے ہونے والے بچے کے لیے نہالچے سیتے پروتے وقت یہی خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ اسے نہایت اچھی طرح سیئے لیکن اس عمل کے دوران وہ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس خیال سے غافل نہیں ہوتی کہ اپنے پیٹ میں وہ ایک بچے کو اٹھائے ہوئے ہے ۔

جسے جنم دے کر وہ ایک عظیم مسرت سے ہمکنار ہونے والی ہے ۔ فرض کیجیئے کہ عین اس وقت کسی ملزمہ کو کبھی جیل میں نہالچے سینے پرونے کا کام ملا ہے اور وہ بھی سینے پرونے کے کام میں مگن ہے یقیناً اسے بھی یہ فکر دامن گیر ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سیئے پروئے مگر اس کا یہ کام محض خوف کے زیر اثر ہوگا ۔ اگرچہ ایک سطح بین انسان ان دونوں کے کام کو دیکھ کر یہی رائے قائم کرے گا کہ دونوں عورتیں ایک ہی وقت میں ایک ہی کام کو ایک سے انہماک کے ساتھ انجام دے رہی ہیں ۔ دونوں کو ایک ہی سے مسائل درپیش ہیں لیکن درحقیقت ان دونوں کے کام میں زمین و آسمان کا فرق ہے"۲۲۔

دور حاضر کا سب سے بڑا معاشرتی مسئلہ یہی ہے کہ محنت یا کام کو اس ناگواری کی انتہا سے اٹھا کر خوشگواری کی اس انتہا تک پہنچایا جائے تا کہ دورِ جدید کے انسان کی اس جذباتی نا آسودگی کو دور کیا جا سکے ۔ جسے "بوریت" کا نام دیا جاتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو اقتصادی نظام کا ایک بے جان پرزہ محسوس کرتا ہے ۔

کام میں محنت ، یکسوئی ، لگن ، انہماک اور دلچسپی پیدا کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے جس کو ہمارے بعض صوفیا نے حکیمانہ مقولہ "دست با کار دل با یار" (ہتھ کار ول ، دل یار ول) میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیا ہے ۔

نمی گویم کہ از عالم جدا باش
ہر کارے کہ باشی باخدا باش

کام چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ، اس میں دنیا و آخرت دونوں کا حسن اس طرح جمع کر دینا چاہیے کہ جس طرح بچے کو جنم دینے والی

عورت کے نہالچے سینے کے عمل میں موجود ہوتا ہے ۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ فی الآخرۃ حسنۃ"[۲۳] ۔

اقبال کے نزدیک خودی کی نگہبانی ہی مقصدِ حیات ہے اس لیے وہ ہر کام یا پیشہ جو محض معاشی تگ و دو اور تلاشِ رزق تک محدود ہو کر رہ جائے اور انسانی خودی کی پرورش نہ کر سکے ، انسان کے شایانِ شان نہیں ۔ خودی کی نگہبانی کے لیے وہ نان زہرناب سے کم نہیں جو اس سے خدا کی محبت کی آب و تاب سلب کر لے ۔

اقبال کے نزدیک کاشت کار کے پیشۂ خاکبازی میں اس کی خودی کی آگ دب گئی ہے اور خدا کے ساتھ اپنے تعلق کو بھول کر رسومِ کہن اور بتانِ شعوب و قبائل کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے ، جسے یہ بتانے کی سخت ضرورت ہے ۔

یہی دین محکم ، یہی فتح یاب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

دنیا میں توحید کو بے حجاب کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو خدا کی محبت کے جذبے سے سرگرمِ عمل بنائے کیونکہ اس کے بغیر انسان کی خودی کی مثال ایک بانجھ دانے کی سی ہے جو بالیدگی اور نشو و نما کی صلاحیتوں سے یکسر عاری ہے جب کہ انسانی زندگی کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ اس سے خدا کی محبت کا بیج پھوٹے ۔

از دروں این گلے بے حاصلے
بس غنیمت داں اگر روید دلے[۲۴]

ظاہر ہے کہ اقبال نے کاشت کار کے سامنے ایک ایمانی اور

روحانی نصب العین رکھا ہے جس سے اس پر زندگی کے ہنگامے سہل ہو جاتے ہیں اور جس کے نتیجے میں دنیوی فارغ البالی اور خوشحالی کی راہیں خود بخود ہموار ہو جاتی ہیں ۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمین کے ہنگامے
بُری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی[۲۵]

بقول مولانا صلاح الدین احمد اقبال اگرچہ غلبۂ ارضی کو خلافت الٰہیہ کا ایک ضروری جزو سمجھتا ہے اور زندگی سے قوت و حرارت ہی مراد لیتا ہے لیکن ان کو وہ مقاصد کا درجہ نہیں دیتا بلکہ وسائل تک ہی محدود رکھتا ہے ۔ دنیا اور اس کی نعمتوں کو مردِ مومن کی میراث سمجھتا ہے ۔ لیکن اسے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی مادی فتوحات میں ہی گم ہو کر رہ جائے اور اس رشتۂ بے نام کو ہاتھ سے چھوڑ دے جو اسے کائنات کی اعلیٰ قدروں سے وابستہ کرتا اور ضمیر کائنات کو ہمنوا بناتا ہے ۔ علامہ اقبال کی پیش کردہ قدریں زمانے کی کروٹوں سے بدلتی نہیں بلکہ دور ایّام پر خندہ زن رہتی ہیں اور زمانہ اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالتا اور درست کرتا چلا جاتا ہے ۔

علامہ اقبال کا نظریۂ خودی اور زمین کے بارے میں ان کے تصوّرات زراعت کے پیشے کے لیے جو فلسفیانہ بنیادیں مہیا کرتے ہیں ، ان میں دہقان کی معاشی ترقی ہی نہیں بلکہ اس کی روحانی ترقی کی بھی ضمانت ملتی ہے اور ایک قومی نصب العین بھی نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اس لیے علامہ اقبال کے یہ نظریات ہماری زرعی توسیع کے لیے فلسفیانہ اساس فراہم کرتے ہیں ۔ جس کا تفصیلی ذکر آخر میں آئے گا ۔

خلاصۂ کلام یہ کہ علامہ اقبال کے نزدیک کھیت صرف زرعی پیداوار حاصل کرنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ انسانی خودی کی تربیت

کا میدان ہے - جہاں انسانی خودی خدا کی محبت ، اپنی تخلیقی جدّت آفرینی اور جوشِ عمل کو بروئے کار لا کر تربیت یافتہ ، مستحکم اور مضبوط ہو جاتی ہے - غرض کھیت کی پیداوار بڑھانے اور اس سے زیادہ نفع کمانے کے لیے محنت و مشقت محض ایک اقتصادی عمل ہی نہیں بلکہ خودی کی تربیت و تکمیل کا ایک اہم ذریعہ ہے تا کہ ہمارے کاشت کاروں کے دلوں میں مقصدِ حیات کا وہ اعلیٰ و ارفع مفہوم جو درسِ خودی سے عبارت ہے اَز سرِ نو تازہ ہو سکے جس کی رُو سے فرد کی حیثیت ملک کے اقتصادی نظام میں محض ایک بے جان پُرزہ کی نہیں بلکہ اس کی ذات ایک منفرد شخصیت کی حامل ہے - کسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے جد و جہد جاری رکھے نہ یہ کہ مادی اور معاشی تگ و دو میں اس قدر کھو جائے کہ اسے اپنے وجود کا احساس ہی نہ رہے -

باب ششم

فکرِ اقبال کی اہمیت

زرعی عمل کی روز افزوں پیچیدگیاں بے شمار عوامل کی اصلاح کا تقاضا کرتی ہیں لیکن ان تمام عوامل میں اصلاحات اس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتیں جب تک کہ خود کاشت کار کے اندر ارادہ ، قوت محرکہ ، عزم اور ولولہ پیدا نہ ہو ۔ ان اوصاف کو پیدا کرنے کے لیے اب تک زرعی ترقی کی تحریک کے لیے صرف محرکات کو ہی کافی مدد مل سکتی ہے لیکن ان معاشی محرکات کے ساتھ ساتھ اگر نظریاتی محرکات سے بھی کام لیا جائے تو اس سے زمینداروں میں امداد باہمی کی ذہنی فضا تیار کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے ۔ نیز لوگوں کے سامنے ایک ایسا مثلی نصب العین بھی رکھا جا سکتا ہے جس سے یہ اوصاف شدت سے ابھریں تا کہ زرعی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی سالمیت کا مقصد بھی پورا ہوتا رہے ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی تعلیمات بہت اہمیت کی حامل ہیں ۔

اگرچہ علامہ اقبال کے پاس اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی قوت نافذہ نہیں تھی تاہم جس حد تک وہ اپنے مخصوص حالات میں کاشت کار کی معاشی زبوں حالی کو دور کرنے کی کوشش کر سکتے تھے ، انہوں نے کی ۔ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے آپ نے ضروری اصلاحات کے لیے جد و جہد کی ، جس کا

تذکرہ اس کتاب میں پہلے آ چکا ہے۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ فکری ہے اور یہ ایک ایسا مہتمم بالشان کارنامہ ہے کہ ان کے نظریات زرعی شعبے میں بہتر اور مطلوبہ نتائج پیدا کرنے میں آج بھی ہمارے لیے بے حد مفید اور قابلِ عمل ثابت ہو سکتے ہیں۔ زمین کے بارے میں ''متاع'' کا قرآنی تصوّر زرعی قیود کو توڑنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے اور کسان کو درسِ خودی دے کر اسے زندگی کے بلند تر مقاصد کے لیے جد و جہد کرنے کا ولولہ بخش سکتا ہے۔ اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ نظریات ہمارے نظریۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔ علامہ اقبال اس دور کے پہلے مفکّر ہیں جنہوں نے زراعت کے شعبے پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کیا۔ ان کے نتائجِ فکر زرعی منصوبہ بندی اور زرعی توسیع کے لیے اساس کا کام دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ہمیں زراعت کے موضوع پر ایسے فکر انگیز اور ولولہ آفریں خیالات دئے۔ جان برمن رینڈل کا قول ہے کہ قومیں اپنے کارناموں سے زیادہ اپنی بصیرتوں کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں[1]۔ علامہ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے قوم کو حیات آفریں افکار ہی نہیں دیے بلکہ قوم کے مخصوص شعبوں پر غور و فکر کر کے قومی فلاح و بہبود کی نئی راہیں سجھائیں۔ ان میں سے زرعی شعبے میں بہتر اور مطلوبہ نتائجِ پیدا کرنے کے لیے اقبال کے نظریات ہمارے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم دنیا کے مختلف ممالک کی زرعی ترقی کا جائزہ لیں تو ہر ملک کے زرعی انقلاب کے پیچھے ہمیں کوئی نہ کوئی دانشور ضرور نظر آتا ہے۔ جس کی تحریروں نے لوگوں کے لیے ایک نئی اُمنگ اور کام کرنے کے لیے نیا جوش و جذبہ عطا کیا۔ مثلاً امریکہ کی زرعی ترقی میں امریکی صدر جیفرسن کے افکار جسے زرعی اعتقادیت (Agricultural Fundamentalism) کا نام دیا جاتا ہے، بہت اہمیت کے

حاصل ہیں ۔ جاپان میں میجی دور میں مختلف دانشوروں نے زراعت کے میدان میں ایک تحریک پیدا کی اور وہاں بھی زرعی اعتقادیت کے مترادف ایک جاپانی اصطلاح (nohonshugi) رائج تھی جس کا تھامس ۔ آر ۔ ایچ ۔ ہیون نے انگریزی میں ترجمہ 'Agriculture-as-the-essenceism'' (یعنی زراعت بطور جوہر اصلی) کیا ہے ۔

جاپان کی زرعی ترقی پر بحث کرتے ہوئے بروس ۔ ایف ۔ جاہنسٹن (Bruce F. Johnston) نے ڈیوڈ لینڈز کے حوالے سے لکھا ہے کہ جاپان میں زرعی ملکیت اور جاگیریں کسی زمانے میں بھی نشانِ عزت و امتیاز نہیں رہیں ۔ اس لیے مغرب کے مقابلے میں وہاں معیشت اور اس کے نتیجے میں خود زراعت کو صنعتی بنیادوں پر استوار کرنے میں کبھی کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا نیز وہاں لوگوں میں اخوت کا جذبہ بادشاہ کے حوالے سے پیدا کیا گیا تھا ۔ جسے جاپانی نسل کا جدِّ امجد اور مورث اعلیٰ (Progenitor) خیال کیا جاتا تھا اور یوں خاندانی وفاداری پھیلتے پھیلتے بادشاہ اور قوم پر محیط ہو جاتی تھی ۔ چنانچہ شعوب و قبائل کی عصبیت کی روکاوٹیں قومی پیمانے پر عمل انگیزی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی تھیں جبکہ موجودہ دور میں سب سے بڑا مسئلہ ہی یہ ہے کہ معاشی ترقی کے لیے لوگوں کو اجتماعی کاموں کے لیے آمادہ بہ عمل کیا جائے ۔ علاوہ ازیں کنفیوشس کی تعلیمات اور جاپانی ایمانیات (Bushido) اور اقدار کے تحت وہاں ایک ایسا قومی جذبہ موجود رہا کہ ایوانِ حکومت سے لے کر شہری کاروبار اور دیہی سطح تک تعاون اور امدادِ باہمی کی سپرٹ موجود تھی اور باہمی حقوق و فرائض کا شعور قومی نفسیات میں سرایت کیے ہوئے تھا[۲] ۔ اسی طرح میکس ویبر Max Weber ، کینتھ بولڈنگ Kenneth Boulding اور دوسرے مصنفوں نے لکھا ہے کہ امریکہ اور یورپ کی پوری اقتصادی ترقی کے پیچھے مارٹن لوتھر Martin Luther ، ولبر فورس

Wilber Force ، کلارکسن Clarkson ، لارڈ شیفتسبری Lord Shaftsbury جیسے مفکرین کے افکار کا بڑا ہاتھ ہے[۳] ۔

ہمیں علامہ اقبال نے اپنے افکار میں زمین کے متاع ہونے کا جو قرآنی تصوّر دیا ہے وہ زراعت کو طویل المدت منصوبے کے تحت ترقی دینے کے لیے بے حد مفید ہے ۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ اقبل اس شعبے میں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو ہمارے نظریات کے کےا عین مطابق ہے ۔ جہاں تک موجودہ زمانے میں اس تصوّر کو عملی جامہ پہنانے کا تعلق ہے اس کی عملی شکل امداد باہمی کی صورت ہے ۔ امداد باہمی پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیاَ جاتا ہے کہ ملکیت کے بارَے میں ہمارے زمیندار اور کسان قطعی طور پر انفرادیت پسند ہیں اور وہ امداد باہمی کے اصولوں کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔ یہ کہہ کرَ ہی مایوس ہو جانا غلط ہے ۔ کیا اس سلسلہ میں ہمیں اسلام اور قرآن حکیم کے دیئے ہوئے عمرانی اور معاشی تصوّرات سے کوئی راہنمائی نہیں مل سکتی ؟ علامہ اقبال نے قرآن حکیم کے مطالعہ سے ایسے تصوّرات اخذ کرکے ہمیں زرعی ترقی کی نئی راہیں سمجھائی ہیں ۔

تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت کھل کرسامنے آ جاتی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں امداد باہمی کی تحریکوں کے پیچھے بھی وہاں کے مفکّرین کا بڑا ہاتھ تھا ۔ بلغاریہ میں ۱۹۰۶ء میں امداد باہمی کی جو نظریاتی تحریکیں آٹھیں ان کے پسِ پشت ٹالسٹائی Tolstoy اور ہنری جارج Henry George کی فکر کارفرما تھی ۔ اسی طرح ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں اتحاد اور بھائی چارے کی جس تحریک نے جنم لیا وہ قدیم عیسائیت کے نظریات کا شاخسانہ تھی ۔ علاوہ ازیں آئسر لینڈ میں ۱۸۳۰ء میں جس ایگریکلچرل پروڈکشن کواپریٹو (Agricultural Production Co-operative) کی بنیاد پڑی ، وہ وہاں کے

مفکّر اوون (Owen) کے افکار کا نتیجہ تھی[۴]۔ جب تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں وہاں کے مفکّرین کے خیالات مختلف اجتماعی اور امداد باہمی کی تحریکوں کو جنم دے سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک جہاں دینِ اسلام کی لازوال فکری و روحانی قوّت موجود ہے، اور علامہ اقبالؔ جیسے دانشور کے افکار زندہ موجود ہیں قوم کے اندر امداد باہمی کے اصولوں پر زراعت کو منظّم کرنے کی کوئی تحریک نہ اُٹھائی جا سکے۔

بعض جدید اور قدیم مفکرین نے زرعی معاشرے کے تہذیبی اور ثقافتی محاسن پر زور دیا ہے مثلاً شہرۂ آفاق مسلم تاریخ دان اور ماہر عمرانیات ابن خلدون کے نزدیک زرعی معاشرہ ہی تمدن کے لیے بنیاد مہیا کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "حضارت اور تمدن کے اموال و تکلفات کا منبع اور سرچشمہ دیہات والوں کی تہذیب و تمدن ہی ہے کیونکہ یہی انسانی آبادی میں بمنزلہ اصل اور جڑ کے ہیں اور انہی کی ارتقائی شکل کا نام شہر اور مدینہ ہے"۔ اس نظریے کی تشریح وہ یوں کرتا ہے۔ "دیہات کے لوگ زندگی کے لذائذ و تکلفات سے بہرہ مند نہیں ہوتے اور صرف اسی حد تک اس دنیا میں ان کا حصّہ ہوتا ہے جس قدر تمدن کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ان کا مرتبہ قدرتاً اہل حضر سے پہلے کا ہے کیونکہ زندگی کا نقشہ اس وقت تک ترتیب نہیں پاتا جب تک اس کے ابتدائی لوازم مہیّا نہ ہوں اور ان لوازم کو ابتداً مہیّا دیہات والے ہی کرتے ہیں اور اس کے بعد اس دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں تکلفات جنم لیتے ہیں"[۵]۔ غرضیکہ ابن خلدون کے نزدیک تمدن کی تاریخ کا نقشہ کچھ یوں ترتیب پاتا ہے کہ پہلے کھیت پیدا ہوا پھر گاؤں، پھر شہر اور پھر حکومتیں اور سلطنتیں۔

ابن خلدون کا یہ بھی خیال تھا کہ تشکیل تمدن کے علاوہ اخلاقی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی زراعت پیشہ آبادی ایک گونہ فوقیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ دیہات کی سادہ زندگی

میں خیر کے پہلو زیادہ قوی ہوتے ہیں ''اہل بدو شہر سے دُور افتادہ رہنے والوں کی اخلاقی حالت شہر والوں کی نسبت بہتر ہوتی ہے - کیونکہ ان کی زندگی فطرت اولیٰ پر مبنی ہوتی ہے - اور شر و فساد کے قدرتی اثرات سے ایک طرح پاک ہوتی ہے''[۶] -

اسی طرح جیفرسن اس بات میں بڑی شدّت سے ایمان رکھتا تھا کہ امریکی قومیت و جمہوریت کی جڑیں زراعت میں پیوست ہیں - امورِ معاشیات سیاسیہ (Political Economy) کے بارے میں اس کی تمام تحریروں کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کاشتکار سے بڑھ کر نہ تو کوئی محبّ وطن ہو سکتا ہے اور نہ جمہوریت پسند - مثلاً وہ کہتا ہے - ''زمین کو کاشت کرنے والے یہ کسان ہمارے انتہائی محترم شہری ہیں (امریکہ کی) پوری آبادی میں سب سے زیادہ قوی اور مضبوط، آزاد اور راست باز یہی لوگ ہیں کیونکہ ملکی آزادی اور مفادات کے ساتھ ان کے رشتے پائیدار اور لازوال ہیں - اس لیے جب تک انہیں زراعت میں روزگار میسّر ہے میں انہیں ملاح، صناع، تاجر یا کچھ اور بنانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا''[۷] - کاشت کار کی ساری زندگی اس قطعہ زمین پر صرف ہو جاتی ہے جس پر آٹھوں پہر کام کرتا ہے اور نھیت کی یہی محبت اسے وطن سے محبت کرنا سکھاتی ہے - کسی دوسرے پیشہ میں جذبۂ حُبّ الوطنی کی پرورش (بلکہ باالفاظ دیگر دھرتی پوجا) کی یہ کیفیت نہیں ملتی - جیفرسن کہتا ہے ''تاجر کا کوئی وطن نہیں ہوتا - کیونکہ زمین کے جس ٹکڑے پر وہ رہتے اور بستے ہیں اس سے انہیں اتنا گہرا قلبی لگاؤ نہیں ہوتا جتنا کہ اس جگہ سے جہاں سے منافع آتا ہو''[۸] - چنانچہ جیفرسن کا خیال تھا کہ کسی معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو قائم و دائم رکھنے کے لیے دیہی اور زرعی معاشرہ کا استقرار و استمرار ضروری ہے - اس لحاظ سے وہ شہری تمدن کو اپنے ملک کی جمہوریت کے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتا تھا - چنانچہ وہ کہتا ہے ''خالص حکومت کے قیام و

انصرام میں بڑے بڑے شہر اور ان شہروں میں بسنے والے انسانی ہجوم بالکل وہی وہی حیثیت رکھتے ہیں جو جسم انسانی پر نمودار ہونے والے پھوڑوں اور ناسوروں کی ہوتی ہے"[۹] ۔ اس بات کی ایک دوسری جگہ وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "اگر ہمارے ہاں بھی بڑے بڑے شہر تعمیر ہونے لگے اور ان کی آبادیاں اتنی گنجان ہو گئیں کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگے جیسا کہ اس وقت یورپ کا حال ہے تو ہمارے قومی مزاج میں بھی خیر کی بجائے شر کا پہلو زیادہ نمایاں ہو جائے گا اور انسان انسان کو کاٹ کھانے کو دوڑے گا"[۱۰] ۔

دور حاضر میں بھی بعض دانشوروں کی فکری رہنمائی میں زرعی ترقی میں بڑی مدد ملی ہے مثلاً بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں ایک جاپانی نژاد پادری کاگاوا (Kagawa) نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے طول و عرض کا دورہ کر کے لوگوں کو یہ وعظ کیا کہ امداد باہمی (Cooperative) درحقیقت عیسائیت ہی کی عملی شکل ہے اس کا نعرہ تھا (Cooperatives are applied Christianity) ۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تبلیغی مہم سے زراعت میں کواپریٹو کو بڑا فروغ ملا اور زراعت میں بڑی ترقی ہوئی ۔ چنانچہ آج بھی وہاں کی زرعی ترقی اور کواپریٹوز کے فروغ میں اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے ۔

چنانچہ ہم یہ بات بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح جیفرسن اور کاگاوا کے افکار نے امریکی زراعت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں اسی طرح علامہ اقبال کے افکار کو مشعلِ راہ بنا کر ہم زرعی ترقی کی راہ ہموار کر سکتے ہیں ۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے فکر کی مندرجہ ذیل خصوصیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

۱۔ کاشتکار کو زمین پیوندی کی بجائے زمین وارستگی کا سبق دے کر اسے اسلام کا آفاقی کردار ادا کرنے کی تحریک ۔

۲- زمین کو متاع اور امانت سمجھنا اور زراعت کے پیشہ کو تعلق با اللہ کی بنیاد بنانا ۔

۳- کاشتکار کو شخصیت کی تعمیر کی تلقین اور اس ناطے سے اسے تسخیرِ کائنات کی عملی جد و جہد پر آمادہ کرنا ۔

۴- خلیفہ الارض ہونے کی حیثیت سے زمین کی پیداواری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بنی نوع انسان کی ضروریات خوراک و پوشاک کو پورا کرنا ۔

د- غربت اور دوسرے انسانی مصائب کے خلاف جہاد اور اس کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی سے استفادہ ۔

علامہ اقبال نے ان افکار کو اشعار کے قالب میں ڈھالا تا کہ اعلیٰ ترین انسانی مقاصد کے تحت زرعی ترقی اور زرعی توسیع کے لیے کاشتکاروں میں تحریک پیدا کی جا سکے ۔ اس ضمن میں ان کا تحریکی فلسفۂ عمل خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو زرعی توسیع کے لیے بلا شبہ ایک محکم فکری اساس مہیا کرتا ہے ۔

باب ہفتم

فکر اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع

فنون لطیفہ کا معاشرتی وظیفہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے نظریات کو جذبات اور احساسات کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے تا کہ عوام الناس کے ذہنوں کو بغیر کسی دقت کے ان سے متاثر کیا جا سکے ۔ فنون اور شعر و شاعری مکمل اور بلا روک ٹوک ابلاغ کا وہ واسطہ ہیں جنہیں معاشرے کو تجرباتی اشتراک کی اساس پر استوار کرنے ، مطلوبہ معاشرتی مزاج پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے بطور تمدنی ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی معاشرے میں تہذیبی اقدار کے نفوذ کے لیے فن و شاعری کا سہارا لیا جاتا ہے کیونکہ ان کے وسیلے سے یہ اقدار بآسانی جزو معاشرہ بن کر فی الفور انسانی شخصیت کا حصّہ بن جاتی ہیں ۔ لوگوں کی روحانی زندگی پر ان کے انہی تعمیری اثرات کے پیش نظر توسیع زراعت جیسے قومی تعمیر نو کے کاموں میں ان کے اہم کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بقول مسٹر موشر ''توسیع زراعت کے کام میں لوگوں کی روح کا بھی عمل دخل ہے''[1]۔ کسی تعمیری کام کو منصۂ شہود پر لانے سے پیشتر ایک نفسیاتی فضا پیدا کرنا ازبس ضروری ہے ۔ مسٹر موشر کے نزدیک ولولہ اور عزم صمیم ''انجن'' علم و ہنر ''آلات و اوزار'' اور پیشے اور شہریت ''مواقع'' کی حثیت رکھتے ہیں'' ۔

اقبال کسی قوم کی مجموعی ترقی کے لیے فن اور شعر و شاعری کے تعمیری کردار سے پوری طرح آگاہ ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں ۔ ''کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس ولولے کی نوعیت پر ہے جو اس کے فنکار اور شاعر حاصل کرتے ہیں''۔ اس لیے وہ شعراء کو ان کی ولولہ انگیز شخصیت کے ناطے سے بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ کیونکہ بقول ان کے کسی روبہ انحطاط یا بیمار شخصیت کی تخلیق سے معرضِ وجود میں آنے والا ایک گیت یا ایک تصویر ہلاکو اور چنگیز کے لشکروں سے زیادہ تباہی لا سکتی ہے ۔ چنانچہ شعر و شاعری کی صرف اسی نوع کو قابلِ قدر گردانتے ہیں جو طاقت اور جمال میں باہمی امتزاج پیدا کرنے کی صفت سے بہرہ ور ہو ۔ اس کیفیت کی جستجو کرنا جسے سائنس کی زبان میں فطرت سے ''موافقت'' کہا جاتا ہے ۔ دراصل روح انسانی پر فطرت کی بالا دستی کو تسلیم کرنا ہے ۔ طاقت فطری محرکات کی مزاحمت کے راستے سے آتی ہے نہ کہ ان محرکات کے عمل کے سامنے اپنے آپ کو ڈال دینے سے ۔ جو کچھ ''موجود ہے'' اس کی مزاحمت کر کے ''جو کچھ وجود میں آنا چاہیے'' کو پیدا کرنا صحت اور زندگی ہے ۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ انحطاط اور موت ہے ۔ خدا اور انسان دونوں پیہم عمل اور جذبہ آفرینش سے زندہ ہیں ۔ ایک سچے فنکار کے تصوّر کو اُجاگر کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں ۔ ''ایسا فنکار جو زندگی سے آنکھیں چار کرتا ہے ۔ دراصل انسانیت کے لیے باعثِ سعادت ہے ۔ وہ خدا کا ساتھی ہے اور اپنی روح میں زمانے اور ابدیت کو ایک دوسرے سے مدغم ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے ۔'' فشٹے کے الفاظ میں ایسا شخص پوری فطرت کو بھرپور ، اور وافر پاتا ہے ۔ برعکس دوسرے شخص کے جو ہر شے کو اس کی اصل حثیت سے بھی نحیف تر ، کمتر اور خالی تر دیکھتا ہے[۳] ۔

فلسفۂ تغیر و طاقت

اقبال کا آئیڈیل طاقت ہے ۔ یہاں تک کہ وہ خدا کو طاقت کا

ہم معنی قرار دیتے ہیں[۴] اور طاقت ور انسان کو بہ نظرِ تحسین دیکھتے ہیں ۔ ایک طاقت ور انسان کے متعلق اپنے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے کہ طاقتور انسان اپنا ماحول خود پیدا کرتا ہے اور کمزور انسان اس ماحول کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں[۵] ۔ قوت گیر صفات کو اپنے اندر سمو لینے سے ایک طاقت ور انسان ایک لامتناہی اُمنگ سے سرشار ہو جاتا ہے اور اپنی ان اُمنگوں کو عملی جامہ پہنا کر کرۂ ارضی پر خدا کے نائب کا مرتبہ حاصل کرنے کا سزاوار وہ تبھی ہو سکتا ہے جبکہ وہ ایک بالکل نیا طبعی اور معاشرتی ماحول معرض وجود میں لائے[۶]۔ بالفاظ دیگر اسے ''خدا کی بادشاہی کو زمین پر لانے'' کی جد و جہد کرنی چاہیے ۔ یہی وہ مناسبت ہے جس سے اقبال کے افکار توسیع زراعت کے لیے گہری معنویت رکھتے ہیں ۔ ان کے فکر کے کئی ایک پہلو تو ایسے ہیں جو فلسفۂ توسیع اور اس کی روح سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں ۔ خصوصاً فلسفۂ خودی ایک ایسا فکری سانچہ فراہم کرتا ہے جس کے اوپر توسیع کے فلسفے کا فکری ڈھانچہ تعمیر کیا جا سکتا ہے ۔ مقاصد کا تعین ہو سکتا ہے اور توسیع زراعت کو ایک بامعنی رخ عطا کیا جا سکتا ہے ۔

تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ زرعی توسیع کا مقصد خارجی طور پر کسی خاص دیہی آبادی کے معیارِ زندگی کو ہنر اور کاریگری کے استعمال سے مسلسل بلند سے بلند تر سطح پر لے جانا ہے ۔ جبکہ باطنی طور پر اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس آبادی میں ایسی اقدار پیدا کی جائیں جو معاشی ترقی کے ساتھ سازگار ہوں اور یہ اقدار اس قوم کے مخصوص تہذیبی ورثے کے عین مطابق ہوں ۔ بالفاظ دیگر یہ دیہی آبادی میں ایک ہمہ گیر تبدیلی کا عمل ہے جو ان کے علم ، ہنر ، رویے ، رجحان اور میلانات میں تبدیلی لاتا ہے ۔ اقبال انقلاب و تغیر کا پیغام بر ہے اور تبدیلی کے لیے اس کی یہ آرزو بے پناہ جوش میں ڈھل جاتی ہے ۔ اس کے نظامِ فکر اور شاعری

میں تغیّر کلیدی حیثیت رکھتا ہے - اور ان کے زاویۂ نگاہ کے مطابق کائنات میں صرف اک تغیّر کو ہی دوام حاصل ہے -

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اک تغیّر کو ہے زمانے میں[۷]

فرد انسانی کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے -

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیر فلک کہیں میں نے[۸]

سماجی زندگی میں بھی یہ تغیر ایک نہ ختم ہونے والی جد و جہد بن جاتا ہے جو معاشرے کو زندگی اور قوت عطا کرتی ہے -

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کش مکش انقلاب[۹]

ایک دوسری جگہ کہتا ہے -

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں[۱۰]

مسئلہ ناداری و غربت

علامہ اقبال آج کے مسلم معاشرے میں جو اساسی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں - ان میں سے ایک مسلم معاشروں میں پھیلی ہوئی عام غربت کو ختم کرنا ہے - غربت اور معاشرتی پسماندگی سے انہیں بہت نفرت تھی اور وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے- مثلاً ان کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو -

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو جائے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے

والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں؟''[۱۱] تاہم ان کے نزدیک غربت سے نمٹنے کے لیے صحیح لائحہ عمل کا تعین صرف اسلامی تہذیب کرتی ہے جس کے مطابق زندگی کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ حسیاتی (Sensate) اور تخئیلاتی (Ideational) تہذیبوں کے برعکس اسلامی تہذیب معیشت اور اخلاق کے باہم دگر منحصر ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ حسیاتی تہذیب میں زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین محض ''خوشگوار ترنگ'' کا حصول ہے۔ جبکہ تخئیلاتی تہذیب میں (لاحاصل) سرور انگیز تصورات میں (گیان دھیان) گم رہنا اعلیٰ ترین معیار ہے۔ اسلام کی مثالی تہذیب میں اعلیٰ ترین نصب العین یہ ہے کہ ایسے معاشرے کو معرض وجود میں لایا جائے جو غم اور خوف سے پاک ہو۔ اس تناظر میں معاشرے سے غربت کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے پیدا ہونے والا ایک بلند ترین اخلاقی داعیہ بن جاتا ہے۔ اقبال کا کہنا ہے ابتدائی دور کی عیسائیت کے پیروکار مفلسی اور دنیا بیزاری کو اپنی شان سمجھتے تھے جبکہ اسلام غربت کو ایک برائی سمجھتا ہے[۱۲]۔ ایک ایسا معاشرہ جو سر تا سر ذلت آمیز مفلسی میں ڈوبا ہوا ہو، اعلیٰ معیار کی ایسی تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتا جو انسانی شخصیت کو اعلیٰ مدارج پر فائز کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اقبال کہتا ہے:

''مفلسی کا آزار انسان کے روحانی قویٰ کا دشمن ہے''[۱۳]۔

''غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلی آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ کہ اخلاقی اور تمدنی اعتبار سے وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔

تم جانتے ہو کہ مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے[۱۴]۔

غربت کے مسئلے پر اخلاقی و معاشی پہلو پر نظر ڈالتے ہوئے وہ معیشت اور اخلاقیات کے باہمی مضبوط ربط پر زور دیتا ہے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ شرع مبیں این است و بس[۱۵]

ان کا کہنا ہے کہ علم الاخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے یا یوں کہیئے کہ ہر شے کی اصل وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت کو ہی لے لو، اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں مدد نہیں دیتی تو پھر اس کا فائدہ[۱۶] ؟

توسیع اور اقبال کے فلسفۂ تعلیم کا باہمی تعلق

اقبال کے فلسفیانہ افکار میں وہ مطلق خوبی جسے انسانی زندگی میں سب سے بلند مرتبہ حاصل ہونا چاہیئے، پرورشِ خودی ہے۔

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے[۱۷]

تو زندگی ہے پائندگی ہے
باقی ہے جو کچھ سب خاکبازی[۱۸]

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ بھی تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو[۱۹]

اقبال کے تصوّر میں فردِ انسانی ''طاقت، توانائی اور ارادے کی اکائی ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی ہے جس کے پاس بے انتہا طاقت ہے اور اس طاقت کو بتدریج روبہ ظہور لانا ہی انسانی سرگرمیوں کا منشا ہے'' اس تصوّر کے مطابق ''انسان کا جوہر اصلی ارادہ ہے نہ کہ ذہانت اور فکری استعداد'' ہیں۔ ان کے خیال میں مثالی اسلامی اخلاق ''ایک مضبوط جسم ہی ایک مضبوط ارادے کا مالک ہوتا ہے۔ اس لیے اسلامی تعلیمات کا مطلوبہ نصب العین انسانی ارادے کی تربیت ہے نہ کہ ذہانت اور عقل و فکر کی''۔ ان کے نزدیک ہر تعلیمی نظام کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ انسان کے کردار کی تشکیل کرے جسے اقبال صحیح معنوں میں انسان کا حتمی سر و سامان سمجھتا ہے جو نہ صرف ایک معاند فطری ماحول natural environment سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے بلکہ اپنے ہم جنس لوگوں کے شانہ بشانہ جد و جہد کرنے اور سبقت حاصل کرنے کے قابل بنائے جو اُس کے ساتھ ایک بھرپور، خوشحال اور وافر رہن سہن کے حصول کی دوڑ میں شریک ہیں[۲۰]۔

توسیع کا کام خواہ نہایت ہی واضح طور پر کاشت کاروں کے معاشی پہلو سے متعلق کیوں نہ ہو یہ کام اس کی شخصیت کے عقلی پہلو کی ترقی پر قانع نہیں رہ سکتا۔ اس کا منتہائے مقصود ایک اولوالعزم شخصیت کا ارتقاء ہونا چاہیے۔ زمین سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی صلاحیت کے لیے بھی ایک خاص قسم کے کردار کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے نئے علوم و ہنر سکھانے پر مرکوز تمام تعلیمی کاوشیں اس طرح کی جانی چاہئیں کہ وہ اس کے ارادے کا ایک لازمی جزو بن کر عمل میں ڈھل جائیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے

جہاں اقبال کا فلسفۂ تعلیم و تربیت توسیع زراعت کے لیے گہری مناسبت رکھتا نظر آتا ہے - کئی ایک ایسے نقاط ہیں جن پر جدید نظریۂ توسیع اور اقبال کے فلسفۂ تعلیم میں واضح طور پر مماثلت پائی جاتی ہے - مثال کے طور پر برٹن کا نظریۂ تعلیم جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمہ زراعت کی مرتبہ کردہ کتاب دستور العمل برائے توسیع کا ایک اہم حصّہ ہے دعویٰ کرتا ہے کہ عمل آموزگاری کے دوران تعلیم فرد کی شخصیت ایک اساسی کل (Integrated whole) میں سے مسلسل عمل تفرید کے ذریعے نئے انداز اختیار کر کے ارتقاء حاصل کرتی چلی جاتی ہے اور نئے اور تازہ کل کو وضع کر کے انہیں اپنے اندر سموتی ہے[۲۱] - اقبال کے ہاں بھی خودی کی تعریف قریب قریب یہ مفہوم لیے ہوئے ہے - وہ کہتے ہیں :

"حیات خودی ایسی کشمکش سے عبارت ہے جو خودی کے اپنے ماحول پر اور ماحول کی خودی پر جو اسی یلغار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے - خودی اس باہمی یلغار کے اس میدانِ کارزار سے باہر ایک غیر جانبدار تماشائی کی طرح کھڑی نہیں رہ جاتی بلکہ یہ اس سارے معرکے میں ایک رہنمائی کرنے والی قوت کی شکل میں موجود ہوتی ہے اور اپنے ہی تجربے کی بنا پر تشکیلی مراحل سے گزرتی اور منضبط ہوتی ہے"[۲۲] -

جیرارڈ کے ہاں زیرِ تعلیم فرد کی شخصیت کا تصوّر بھی اقبال کے اس تصوّرِ خودی کے بالکل قریب ہے جس کا ابھی ہم نے اوپر خطباتِ اقبال سے اقتباس درج کر کے حوالہ دیا ہے. رابنسن جیرارڈ کے اس تصوّرِ متعلم کی وضاحت جو اس نے اپنی کتاب "سائنس اور سائنسی تعلیم کی نوعیت" میں پیش کیا ہے[۲۳]-

برٹن (Burton) کے نزدیک زیر تعلیم فرد کا تصوّر ایک ہدف کی متلاشی ہستی کا تصوّر ہے - جس کی تمام سرگرمیوں کا رُخ اپنے

مقاصد کی سمت میں ہوتا ہے اور وہی انہیں منضبط کرتی ہیں ۔ اور توازن کو بحال اور برقرار رکھنے کے لیے آخر کار ایک عمومی مقصد کا ہونا ضروری ہے ۔ زیرِ تعلیم شخص ایک کلی وجود کی شکل میں اپنا ردِ عمل ظاہر کرتا ہے اور یہ ردِ عمل مجموعی صورتِ حال ، مجموعی احوال اور مجموعی سانچوں کے خلاف ہوتا ہے اور اس تعلم کا ماحاصل تاثرات ، تاثرات کا انضباط ، نئی قدریں ، تفہیمات ، رویے ، بصیرتیں ، خصوصی استعدادیں اور ہنر ہوتے ہیں[۲۴] ۔

کسبِ علم کرنے والے کے جو اوصاف برٹن نے بیان کیے ہیں ان کا سراغ ہمیں اقبال کے مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتا ہے ۔

"ہر آدمی اپنی "شاکلہ" کے مطابق عمل کرتا ہے اور تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون بہترین طریق ہدایت پر گامزن ہے"[۲۵] اس طرح میرے تجربے کا حاصل محض ایک دوسرے سے اعتبار پکڑنے والے اعمال کا وہ سلسلہ ہے جو ایک رُخ عطا کرنے والے مقصد کے وحدت کی وجہ سے باہم مرتبط ہوجاتے ہیں ۔ آپ میری شخصیت کے خلاء میں پڑی ہوئی ایک چیز یا محض زمانی ترتیب میں چند ایک تجربوں کے مجموعے کے طور پر صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتے اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ مجھے میرے فیصلوں ، میرے ارادی رویوں ، میرے مقاصد اور میرے ولولوں کے ذریعے میرے اعمال کی تعبیر کےذریعے مجھے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کریں[۲۶] ۔

انسان بحیثیت مظہر ارادہ

انسان کو ایک ارادے کی مظہر ہستی اور زندگی کو ایک اور نصب العین کے لیے جد و جہد کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اقبال انسانی شخصیت کو مختلف النوع ارادوں کی باہمی ترتیب متصور کرتے ہیں ۔ انسانی شخصیت کے پہلوؤں کی تشکیل کرنے والے ارادوں کی فہرست نیچے دی جاتی ہے ۔

شخصیت کے پہلو	احتیاجات		داعیات
حیاتی	۱ خوراک		ارادہ وجود نفس
	۲ لباس		ارادہ بقا
	۳ رہائش		ارادہ زیست
عمرانی حیات	۱ ازدواج		
	۲ بقائے نسل		ارادہ بقائے نسل
عمرانی ثقافتی	۱ تعلیم		ارادۂ حصول علم
	۲ کسبِ معاش		ارادہ کسب مال و افزائش دولت
نفسیاتی	۱ ادراک و تعقل	ہم آہنگی	ارادہ ادراک و تعقل
	۲ ارادہ و عزم		ارادہ عمل
	۳ جذبہ و محبت		ارادہ محبت
انفسی	۱ شعور ۲ لاشعور	ہم آہنگی	شعور و لاشعور کو ہم آہنگ کرنے کا ارادہ
ماورائی	۱ علم		حقیقت اولیٰ کو جاننے کا ارادہ
	۲ فنون لطیفہ		دنیا کو ایک جمالیاتی نظام میں ڈھالنے کا ارادہ
	۳ اخلاقیات		دنیا کو ایک اخلاقی نظام میں ڈھالنے کا ارادہ
	۴ مذہب ا تعلق باللہ		تعلق با اللہ پیدا کرنے کا ارادہ
	ب اجابت دعا		دعا میں تاثیر پیدا کرنے کا ارادہ
	ج قرب الٰہی		قرب باری تعالیٰ کے ذریعے حیاتِ جاوداں کا ارادہ
	د مثالی معاشرہ		دنیا میں مثالی معاشرہ پیدا کرنے کا ارادہ

اسلام جس مثالی تمدن کے قیام کا داعی ہے اس کا مطمح نظر ایک ایسی شخصیت کی تعمیر ہے جس میں یہ تمام ارادے اس طرح منضبط ہوں کہ شخصیت کے ماورائی پہلو سے تعلق رکھنے والے ارادوں کو سب پر فوقیت حاصل ہو اور دوسرے تمام ارادے ان کے زیرِ اثر ہوں ۔ بنا بریں اقبال کا تصوّر خودی خود شعوری کی وہ قسم ہے جو خدا شعوری سے پیدا ہوتی اور نشو و نما پاتی ہے ۔

خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لا الہ الا اللہ[۲۷]

اقبال کے مطابق جب انسان میں ایسی شخصیت معرضِ تشکیل میں آتی ہے تو انسان ایک حیاتِ نو پاتا ہے ۔ جب خدا شعوری اس کی خود شعوری کو روشنی عطا کرتی ہے تو اسے کائنات میں اپنے اس اصلی مقام سے آگہی نصیب ہوتی ہے کہ وہ قدرت کی عظیم ترین قوتوں میں سے ایک ہے جس کو خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے کہ وہ فطری ماحول کو مسخّر کر کے ایک مثالی معاشرہ قائم کرے اور کائنات کو طرحِ نو دے کر نئے انداز میں استوار کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال انسان کی محض ذہنی و فکری نشو و نما کو بے اطمینانی کے ساتھ دیکھتا ہے ۔

شخصیت کا ذہنی و فکری پہلو ہماری مجموعی شخصیت کا محض ایک پہلو ہے ۔ من حیث الکل تشخص کا حصول اس جہان بسیط کے محض متنوع اثرات اپنے ذہن پر مرتسم کرنے اور ان کا مجرد مشاہدہ کرنے سے ممکن نہیں ۔ نہ ہی یہ محض ان تاثرات کو وصول کرنے اور انہیں فکری اشکال عطا کر دینے سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ان مہیجات کا رُخ مثالی نصب العین اور مقاصد کی طرف پھیرنے سے ہی وہ کُلی تشخص پیدا ہوتا ہے جس سے اس کے اندر یہ احساس جنم لیتا ہے کہ وہ قدرت کی عظیم الشان قوی میں سے ایک ہے[۲۸] ۔ اگر

ماورائی قدریں انسان کے تمام ارادی نظام پر حاوی ہوں تو یہ اس میں ذوق خدائی رکھنے والی شخصیت کو نشو و نما دیتی ہیں۔ نتیجۃً اس میں ایسی بصیرت جلا پاتی ہے کہ وہ اس مادی عالم کو اعلیٰ عمرانی مقاصد کے حصول کے لیے اپنے زیرِ نگیں سمجھتا ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی[۲۹]

اور

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمین سے تا بہ ثریا تمام لات و منات[۳۰]

پھر

یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

بالائے سر رہا تو نام اس کا آسمان
زیرِ سر آ گیا تو یہی آسماں زمین[۳۱]

پھر یہ بھی ملاحظہ ہو۔

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ[۳۲]

انسانی مقاصد کے حصول میں حائل مادی عالم کی رکاوٹیں دراصل تگ و دو کے لیے ایک ترغیب اور خودی کی نمو کے لیے ایک سازگار ماحول مہیا کرتی ہیں ۔ قرآن کریم کی تعلیمات کی رُو سے وہ کائنات جس سے ہمیں سابقہ ہے باطل نہیں ہے ، اس کے فائدے ہیں اور سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ ان کی پیش کردہ رُکاوٹوں پر غلبہ پانے کی جد و جہد میں ہماری بصیرت صیقل ہوتی ہے ۔ ہم ان کی ظاہری سطح کی تہہ میں پوشیدہ حقیقت کو جاننے کے لیے غوطہ زن ہوتے ہیں اور خدا کے مزید قریب ہو جاتے ہیں[۳۳] کیونکہ یہ عالم محسوس پر تصرف اور غلبہ ہی ہے جو ہمیں اس محسوس (کائنات) سے آگے جانے کے قابل بناتا ہے[۳۴]۔ اس لیے اقبال کی نصیحت یہ ہے کہ عالمِ مادہ جو خودی کے سامنے اس کے مد مقابل کے طور پر آ کر کھڑا ہوتا ہے ، فی الحقیقت ایک ناگزیر رکاوٹ ہے جو ہماری ہستی کو ایک تازہ شکل عطا کرتی ہے[۳۵] ۔

عملی رویّہ

اقبال کے ان تصورات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کے نظامِ فلسفہ میں عملی یعنی سائنسی اور تجرباتی رویہ ایک انتہائی اہم مقام حاصل کر لیتا ہے ۔ کیونکہ فطری ماحول کی تسخیر کے ذریعے ہی انسانی خودی اعلیٰ روحانی مدارج تک پہنچنے کے لیے نمو پاتی ہے ۔ اس ضمن میں اقبال ''عمل'' کو فکر کی ایسی ''اعلیٰ ترین شکل'' کی حیثیت سے دیکھتا ہے جو ہر لحظہ اپنے نتائج پیدا کرتی چلی جاتی ہے ۔

یہی آئینِ فطرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے[۳۶]

اور

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے[۳۷]

اور یہ بھی ملاحظہ ہو ۔

ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں
انہیں کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام[۳۸]

اقبال ایسے انسان پر افسوس اور ماتم کرتے ہیں جو اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل نہیں ہوتا ۔

ناپید ہے بندہ عمل مست
باقی ہے فقط نفس درازی

ہر مسلماں رگِ باطل کے لیے نشتر تھا
اس کے آئینۂ ہستی میں عمل جوہر تھا[۳۹]

وہ ایسے علم کی پُر زور مذمت کرتے ہیں جو آمادۂ پیکار نہیں کرتا ۔ اسی لیے وہ ایسے تمام لٹریچر اور فلسفے کی بھی مذمت کرتے ہیں جو عمل پر منتج نہیں ہوتا ۔

ناداں ادب و فلسفہ کوئی چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو[۴۰]

اور

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت[۴۱]

ان کے نزدیک صرف یقینِ محکم ہی آبِ حیات ہے اور صرف وہی فلسفہ ہائے زندگی قابلِ اعتنا ہیں جو مضبوط عقائد سے قوت حاصل کرتے ہیں اور عمل تک لے جاتے ہیں ۔

حرف اس قوم کا بے سوز عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جن کا ضمیر[۴۲]

ایک دوسری جگہ فرمایا

جہان تازہ کی افکارِ تازہ سے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا[۴۳]

لیکن واضح رہے کہ عقیدہ و عمل دونوں کے سوتے ایسے اعلیٰ اصولوں اور بلند مقاصد سے پھوٹتے ہیں جنہیں زندگی میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہوتا ہے۔

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ اور مہر کو تاراج[۴۴]

ایک ایسی قوم جو زندگی کے اعلیٰ اصولوں اور مقاصد سے ولولہ پاتی ہو وہ کبھی ایک حالت پر قانع نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اسے اپنی حالت کو بدلنے اور اپنی دلی خواہشات کے مطابق ماحول کو ڈھالنے کے لیے ایک نہ ختم ہونے والی جد و جہد کرنی چاہیے۔

ایک ایسا مومن جو رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ایک مثالی معاشرے کو وجود میں لانے کے ولولے سے تحریک پاتا ہو کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اسے تو تمام دنیا مسخر کرنا ہے، اسے اپنے اردگرد کے طبعی ماحول کو زیادہ پیدآور (Productive) بنانے کے لیے انہیں منظّم و منضبط کرنا ہے تا کہ خوف و حزن سے پاک معاشرہ پیدا ہو سکے۔ چنانچہ ایک ہمیشہ جاری و ساری رہنے والا انقلاب اس کی زندگی کا مشن ہوتا ہے۔

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ[۴۵]

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوق انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب

ندرتِ فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگ خا را لعل ناب[۴۶]

اس لیے وہ انسان کو ایسی نامکمل کائنات کے خلاف ایک جہدِ مسلسل کے لیے پکارتا ہے جسے انسانی کاوشوں سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچنا ہے اور اسے اپنا ماحول خود پیدا کرنا ہے۔

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زماں و مکاں توڑ کر

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیٔ فکر و کردار کا

تُو ہے فاتحِ عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت[۴۷]

توسیع میں فلسفۂ اقبال بطور دلیلِ راہ

اوپر دیئے گئے اقتباسات سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی شاعری امید، اعتماد، ولولے اور عزم مصمّم کا ایک پیغام ہے۔ اس کے تمام فلسفے کو ایک جملے میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے: مقاصد جتنے اعلیٰ ہوں گے اسی قدر ان کے حصول کے لیے شدت سے جدوجہد ہوگی اور جتنی شدت سے جدوجہد زیادہ ہوگی اور رفتارِ عمل جتنی تیز ہوگی اتنے ہی نتائج مثبت ہوں گے۔]

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں
شرط اسؔ کے لیے ہے تشنہ کامی[۴۸]

ہمت کو شناوری مبارک
پیدا نہیں بحر کا کنارا[۴۹]

چاہے تو بدل ڈالے ہئیت چمنستان کی
یہ ہستی دانہ ہے، بینا ہے، توانا ہے[۵۰]

مندرجہ بالا تصریحات سے ظاہر ہے کہ اقبال کی شاعری سے جنم لینے والی جذباتی فضا معاشی خوشحالی کے نظریے کو جو زرعی توسیع کا ایک لازمی وظیفہ ہے، مقبول عام بنانے کے لیے کتنی سازگار ہے۔ اس کی فلسفیانہ بصیرتیں اور شاعرانہ تخیلات و اشارات ہمارے عوام کے لیے خصوصی کشش رکھتے ہیں۔ اقبال کے فکر و فن کی یہ خوبیاں اس کے پیغام کو زرعی توسیع کے لیے بے حد موزوں بنا دیتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کا کلام ہر شعبہ زندگی میں ترقیاتی جد و جہد کے لیے ہراول (حدی خواں) کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور توسیع زراعت یقیناً ان میں سے ایک ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے توسیعی کارکنوں کے لیے اقبال کی شاعری کا مطالعہ ضروری ہے۔ کیونکہ یہ مطالعہ نہ صرف معاشرتی ترقی کے لئے ایک تمدنی دلیل و جواز کے طور پر ضروری ہے بلکہ اپنے زاویۂ نگاہ اور تصورِ کائنات میں انقلاب لانے لیے بھی ناگزیر ہے۔

——: o :——

حوالہ جات و حواشی

باب اوّل ۔ اقبال کی زراعت سے دلچسپی

1. The Development of Metaphysics in Persia, Bazm-i-Iqbal, 2 Narsingdas Garden, Club Road, Lahore, Pakistan (P. 1).

نیز دیکھئے علم الاقتصاد ، اقبال اکادمی کراچی ، ص ۳۰ -

۲- حرف اقبال ، مرتبہ شاملو ، المنار اکادمی لاہور نومبر ۱۹۴۵ء ، ص ۸۰ ، ۸۱ -

۳- اوراقِ گم گشتہ ، مرتبہ رحیم بخش شاہین ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ، اپریل ۱۹۷۵ء ، ص ۲۶۷ ، ۲۶۸ -

۴- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ص ۶۱۳ (۱۵۱) -

۵- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۳۹ (۳۹) -

۶- کلیاتِ اقبال اردو (ارمغانِ حجاز) ، ص ۶۷۸ (۳۶) -

۷- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ص ۶۹۴ (۱۰۶) -

۸- کلیاتِ اقبال فارسی (ارمغانِ حجاز) ، ص ۹۵۰ (۷۱) -

۹- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ص ۶۵۹ (۷۱) -

۱۰- کلیاتِ اقبال فارسی (زبورِ عجم) ، ص ۴۸۶ (۹۴) -

۱۱- کلیاتِ اقبال اردو (بالِ جبریل) ، ص ۴۰۲ (۱۱۰) -

۱۲- حرفِ اقبال مرتبہ شاملو ، ص ۱۰۸ -

۱۳- ایضاً ، ص ۱۰۱ -

باب دوم ۔ مسئلۂ ملکیتِ زمین

1. Reconstruction of Religious Thought in Islam, Sheikh Mohammad Ashraf, Kashmiri Bazar, Lahore (P. 151).

۲- علم الاقتصاد ، اقبال اکادمی کراچی ، ص ۲۳ -

۳- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ص ۷۹۴ (۲۰۶) -
۴- علم الاقتصاد ، ص ۱۵۲ -
۵- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۱۲۹۰ (۲۹۰) -
۶- کلیاتِ اقبال اردو (بال جبریل) ، ص ۴۱۱ (۱۱۹) -
۷- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ص ۶۶۱ (۷۳) -
۸- ایضاً ، ص ۶۶۹ (۸۱) -
۹- ایضاً ، ص ۶۹۷ (۱۰۹) -
۱۰- کلیات اقبال اردو (ارمغان حجاز) ، ص ۶۵۶ (۱۳) -
۱۱- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ص ۶۶۱ (۷۳) -
۱۲- ایضاً -
۱۳- قرآن حکیم - سورۃ الماعون آیت ۷ -
۱۴- "اسلام کا زرعی نظام" مولفہ مولوی محمد تقی امینی ، ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ، ص ۱۱۷ ، ۱۱۹ -
۱۵- "اسلام کا نظریہ ملکیت" مؤلفہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ، ص ۷۰ ، ۷۱ -
۱۶- ایضاً ، ص ۷۲ -
۱۷- ایضاً ، ص ۶۳ -
۱۸- اقبال کے حضور ، حصہ اول سید نذیر نیازی ، اقبال اکادمی کراچی ۱۹۷۱ ، ص ۲۹ -
۱۹- ایضاً ، ص ۲۸ -
۲۰- انوار اقبال مؤلفہ بشیر احمد ڈار ، اقبال اکادمی کراچی مارچ ۱۹۶۷ء ص ۲۴۵ ، ۲۴۶ -
۲۱- حجۃ اللہ البالغہ جلد دوئم ، ص ۳۱۱ (دیکھئے "اسلام کا زرعی نظام" محمد تقی امینی ، ص ۴۳) -
۲۲- اقبال کے حضور ، ص ۷۵ ، ۷۷ -
۲۳- یہ اقتباس ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب سے راقم الحروف کی نجی گفتگو پر مبنی ہے -

باب سوم - زمین بطور متاع و ملکیت

۱- قرآن حکیم - سورۃ آل عمران آیت ۱۳ -

۲- اسلامی اخوّت کے ان نظائر میں ہمارے لئے کوئی اخلاق سبق بھی ہے یا انہیں محض افسانوی قصوں کے طور پر دہرایا جاتا ہے - (مؤلف)

3. Agricultural Development and Economic Growth. Ed: Herman M. M. Southworth and Bruce F. Johnston Cornell University Press, Ithaca, New York, 1967.
4. Utah Science, (U.S.A.) Vol. XX No. 4 (P. 2)
5. Thomas Jefferson on Democracy, by Saul K. Padover, New American Library of World Literature, New York. (P. 69)

۶- کلیاتِ اقبال اردو (ضرب کلیم) ، ص ۵۷۸ (۱۱۶) -

۷- دیکھئے

Nationalism and Ideology by Barbara Ward W.W. Norton and Co. Inc. New York, 1966.

۸- اقبال کے حضور حصہ اوّل ، ۲۳۹ ، ۲۴۰ -

۹- کلیاتِ اقبال اردو (بالِ جبریل) ، ص ۴۰۹ (۱۱۷) -

۱۰- روزگارِ فقیر جلد اوّل ، فقیر سید وحید الدین ، لائن آرٹ پریس (کراچی) ۱۹۶۶ء ، ص ۴۹ -

۱۱- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ص ۵۷۸ ۱ (۱۱۶) -

۱۲- روزگارِ فقیر جلد اوّل ، ص ۴۹ -

13. Harmony and Conflict in Modern Society, by J. Pen McGraw Hill Publishing Co., London 1962 (P. 227).

۱۴- راقم الحروف کے علم کی حد تک پاکستان میں ڈاکٹر عبدالرحیم چوہدری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضمن میں اپنے خیالات شائع شدہ صورت میں پہلی بار پیش کئے - موصوف نے ۱۹۵۲ء میں خیرپور سے ایک چھوٹا سا پمفلٹ "پیپلز فارمنگ" (Peoples Farming) کے نام سے انگریزی میں شائع کیا - چھتیس صفحات پر مشتمل اس چھوٹے سے کتابچے میں آپ نے ملک میں زراعت کی تنظیم نو کا ایک عملی منصوبہ پیش کیا جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ حکومت کی مالی امداد کے بغیر مقامی وسائل کی تنظیم سے یہ منصوبہ بتدریج

نیچے سے اوپر کو بڑھتا تھا اور اپنے مخصوص اسلامی رنگ میں زرعی ، اقتصادی ، صنعتی ، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے زینے طے کرانے کی ضمانت مہیا کرنا تھا ۔ افسوس یہ انتہائی مفید منصوبہ عمل کی دنیا میں آج تک متشکل نہیں ہو سکا ۔

اس منصوبے کے بارے میں راقم الحروف کی جن ماہرینِ زراعت سے بھی گفتگو ہوئی ہے وہ سبھی اس کی افادیت کے تو قائل ہیں لیکن محض اس بنا پر اسے ناممکن العمل سمجھتے ہیں کہ پاکستانی کاشتکار اپنے جذبۂ ملکیت سے کسی بھی صورت میں دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ زمین کے ضمن میں قرآن کے تصورِ متاع کے بارے میں علامہ اقبال کی تشریحات کو عام کیا جائے تاکہ ان رُکاوٹوں کو دور کیا جا سکے اور پاکستان میں اسلامی طرز پر کواپریٹیو فارمنگ کی راہ ہموار کی جا سکے ۔

باب چہارم ۔ جدید زرعی مسائل پر علامہ اقبال کے نظریات کا اطلاق

۱- آج کی زراعت ، امیر احمد خاں ، شعبہ مطبوعات ادارہ زرعی اطلاعات مغربی پاکستان ۱۹۶۷ء ، ص (۱۳۱ ، ۱۳۳) ۔ نیز دیکھیے
Year Book of Agriculture, U.S.D.A. 1970.

۲- زمینی ملکیت کا تصور تاریخی قوتوں کے زیر اثر جس تیزی سے ناپید ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک مندرجہ ذیل گوشوارہ میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

گوشوارہ نمبر ۱

نام ملک یا برِ اعظم	مجموعی آبادی میں کسانوں کا تناسب ۱۹۵۰ء	۱۹۶۵ء
ایشیا (چین کے علاوہ)	۶۴ فیصد	۶۵ فیصد
چین	۶۹ ,,	۶۳ ,,
روس	۵۰ ,,	۳۲ ,,
افریقہ	۷۶ ,,	۷۴ ,,

یورپ	۳۳ ,,	۲۳ ,,
اوقیانوسیہ (بحر اوقیانوس کے ممالک یعنی آسٹریلیا ، نیوزی لینڈز ظبی اور دیگر جزائر	۲۲ ,,	۱۹ ,,
وسطی امریکی	۲۴ ,,	۱۶ ,,
شمالی امریکہ	۱۴ ,,	۶ ,,
جنوبی امریکہ	۵۹ ,,	۵۴ ,,
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۵ ,,	۶ ,,
پوری دنیا	۵۶ ,,	۵۲ ,,

گوشوارہ نمبر ۲

نام ملک	مجموعی آبادی میں کسانوں کا تناسب
پاکستان	۷۴ فیصد
جاپان	۲۷ ,,
تائیوان	۴۷ ,,
اسرائیل	۱۲ ,,
ڈنمارک	۱۵ ,,
نیدر لینڈ	۹ ,,
بلجیم	۶ ,,
ہنگری	۳۱ ,,
یوگوسلاویہ	۵۳ ,,
برطانیہ	۴ ,,
آسٹریلیا	۱۰ ,,
کینیڈا	۱۲ ,,

ان دونوں گوشواروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا بھر میں زمینداروں اور کاشتکاروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے - تازہ ترین اعداد و شمار کے لئے عالمی ادارہ خوراک و زراعت کی رپورٹیں دیکھئیے -

امریکہ کی موجودہ صورت حال کے تفصیلی مطالعہ کے لئے دیکھیے -

Another Revolution in Farming, Lyle P. Schertz and others. U. S. Department of Agriculture, Washington, D. C. 1979.

اور

Structure Issues of American Agricultue, U.S. Department of Agriculture. Economics, Statistics and Cooperative Service. Agricultural Economic Report 438 (November 1979).

۴- اس ضمن میں عالمی ادارہ خوراک و زراعت کی سالانہ رپورٹوں کے مطالعہ سے تازہ ترین صورت حال کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۵- "سبز انقلاب" کی تفصیلات جاننے کے لئے دیکھئے۔

Seeds of Change by Lester R. Brown Praeger Published, New York, 1970.

۶- زرعی ڈائجسٹ ۔ اسلام اور زراعت نمبر ، جلد ۱۵ ، شمارہ ۲ ، ۳ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے "اسلامی نظام زراعت" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں پوری تفصیلات درج ہیں۔

۷- اسلام کا زرعی نظام مؤلفہ مولوی محمد تقی امینی ، ص ۳۰۲۔

۸- زرعی ترقی کے لئے علامہ اقبال کے تحریکی فلسفہ پر بحث آخری باب میں آئے گی۔

9. Japan in Transition : One hundred years of Transition, Ministry of Foreign Affairs; Japan, Tokyo 1958. (P. 90)

۹- کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ، ۶۶۱ (۷۳)۔

باب پنجم ۔ کھیت ۔ خودی کی تجربہ گاہ

1. Reconstruction of Religious Thought in Islam (P. 179).

۲- علم الاقتصاد ، ص ۲۳۔

۳- ایضاً ، ص ۲۳۔

۴- ایضاً ، ص ۲۱۔

۵- ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر ، ترجمہ مولانا ظفر علی خاں ، ناشر سید محمد شاہ ، سیکرٹری اقبال اکادمی لاہور ۔ س ۔ ن ، ص ۳۲۔

۶- کلیاتِ اقبال فارسی (رموز بیخودی) ، ص ۱۳۷ (۱۳۷)۔

۷- ایضاً ، ص ۱۳۹ (۱۳۹)۔

۸- قرآنِ حکیم - سورہ التوبہ ، آیت ۹۷ -
۹- اسلام کا اقتصادی نظام مولانا حفظ الرحمن سیوہاوی
۱۰- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۴۴۴ (۱۵۳) -
۱۱- ایضاً ، ص ۱۵۴ -
۱۲- اقبال کے حضور
۱۳- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۱۹۲ (۱۹۲) -
۱۴- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ص ۶۲۹ (۱۶۱) -
۱۵- کلیاتِ اقبال فارسی (اسرارِ خودی) ، ص ۱۸ (۱۸) -
۱۶- کلیاتِ اقبال اردو (بالِ جبریل) ، ص ۴۱۱ (۱۱۹) -
۱۷- ایضاً ، ص ۱۲۰ -
۱۸- کلیاتِ اقبال فارسی (پیامِ مشرق) ، ص ۲۸۴ ، ۱۱۲ -
۱۹- کلیاتِ اقبال اردو (بال جبریل) ، ص ۴۲۴ ، (۱۳۲) -
۲۰- ایضاً ، ص ۴۰۰ (۱۱۰) -
۲۱- قرآن حکیم - سورہ الشوریٰ ، آیت ۲۰ -
22. Simone Weil, The Need for Roots, Beacon Press, Boston, 1950 P. 95).
۲۳- قرآن حکیم - سورۃ البقرہ آیت ۲۰۱ -
۲۴- کلیات اقبال فارسی (ص ۶۶۱) -
۲۵- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ص ۴۷۳ (۱۱) -
۲۶- تصوراتِ اقبال، صلاح الدین احمد ، ادارہ ادبی دنیا لاہور ۱۹۶۷ء-

باب ششم - فکرِ اقبال کی اہمیت

1. Patterns of Faith in America Today, Ed: F. Ernest Johnson, Collier Books, New York (P. 171).

"Men are saved by vision rather than works—although works are the only test of vision and for most men vision seems to only come through works and in the midst of work".

(John Herm Randall, Jr.)

علامہ اقبال فرماتے ہیں :

جہانِ نو کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

۲- دیکھئے :

Agricultural Development and Economic Transformations— A Comparative Study of Japanese Experience by Bruce F. Johnston. (A paper read at Conference on Relations between Agriculture and Economic Growth held at Stanford University U.S.A. Nov. 11-12, 1962.

نیز دیکھئے

Bushido—The Soul of Japan by Inazo Nitobe Charles E. Tuttle Co. Rutland, Vermont and Tokyo (1969).

اور تقابلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ کیجئے

The Soul of America by Arthur Hobson Quinn Pepetua Book, A.S. Barnes & Co. Inc. New York (1961).

۳- دیکھئے -

Beyond Economics by Kenneth Boulding, University of Michigan Press U.S.A. (1970)

۴- دیکھئے -

Cooperation and Integration in Agricultural Production by Otto Schiller, Asia Publishing House, London, 1969.

۱۰- جیسا کہ باب سوم میں ذکر آ چکا ہے علامہ اقبال بھی شہروں کے پھیلاؤ کے خلاف تھے کیونکہ وہ شہروں کے پھیلاؤ کو ثقافتی و تہذیبی ترقی کے لئے ناسازگار خیال کرتے تھے - (دیکھیے روزگار فقیر جلد اوّل ، ص ۴۹) -

11. Farm Goals in Conflict. Iowa State University Press, Ames, Iowa, USA (P. 20).

باب ہفتم - فکرِ اقبال کی روشنی میں زرعی توسیع

1. Getting Agriculture Moving by A.T. Mosher. Frederick A. Praegers Publishers, New York (1966).

2. Thoughts & Reflections of Iqbal. Ed. Syed Abdul Vahid. Sh. Muhammad Ashraf. Kashmiri Bazar Lahore, Pakistan. (P 145).

۳- ایضاً -

4. Stray Reflections, Ed. Javed Iqbal. Sh. Ghulam Ali & Sons, 1961 (P 10)

5. Thought and Reflection of Iqbal.(P.)

6. Ibid.

۷- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۱۴۸ (۱۴۸) -

۸- ایضاً ، ص ۸۲ (۸۲) -

۹- کلیاتِ اقبال اردو (بالِ جبریل) ، ص ۳۹۲ (۱۰۰) -

۱۰- کلیاتِ اقبال اردو (ارمغانِ حجاز) ، ص ۶۹۴ (۴۲) -

۱۱- علم الاقتصاد (ص ۲۴)

12 Thoughts and Reflections of Iqbal. (P. 145)

۱۳- علم الاقتصاد - (ص ۲۳)

۱۴- علم الاقتصاد - (ص ۲۲)

۱۵- کلیاتِ اقبال (فارسی) ، ص ۱۵۴ -

۱۶- علم الاقتصاد - (ص ۲۱)

۱۷- کلیاتِ اقبال اردو (بالِ جبریل) ، ص ۳۴۱ (۴۹) -

۱۸- ایضاً ، ص ۳۶۴ (۷۲) -

۱۹- کلیاتِ اقبال اردو ، ص ۱۹۲ -

20. Thoughts and Reflections of Iqbal. (P. 35, 41, 45).

21, Agricultural and Home Economics Extension Manual, USDA & USAID Publication.

22. Reconstruction of Religious Thought in Islam. (P. 102).

23. The Nature of Science and Science Teaching by J. T. Robinson Wordsworth Publishing Co. Inc. Belmont, California (P. 121).

“ Gerard presents a pattern of thinking about the living state as a function of time which is represented by the writer in Figure below

Figure *A schema representing Gerard's conception of the organism.* ”

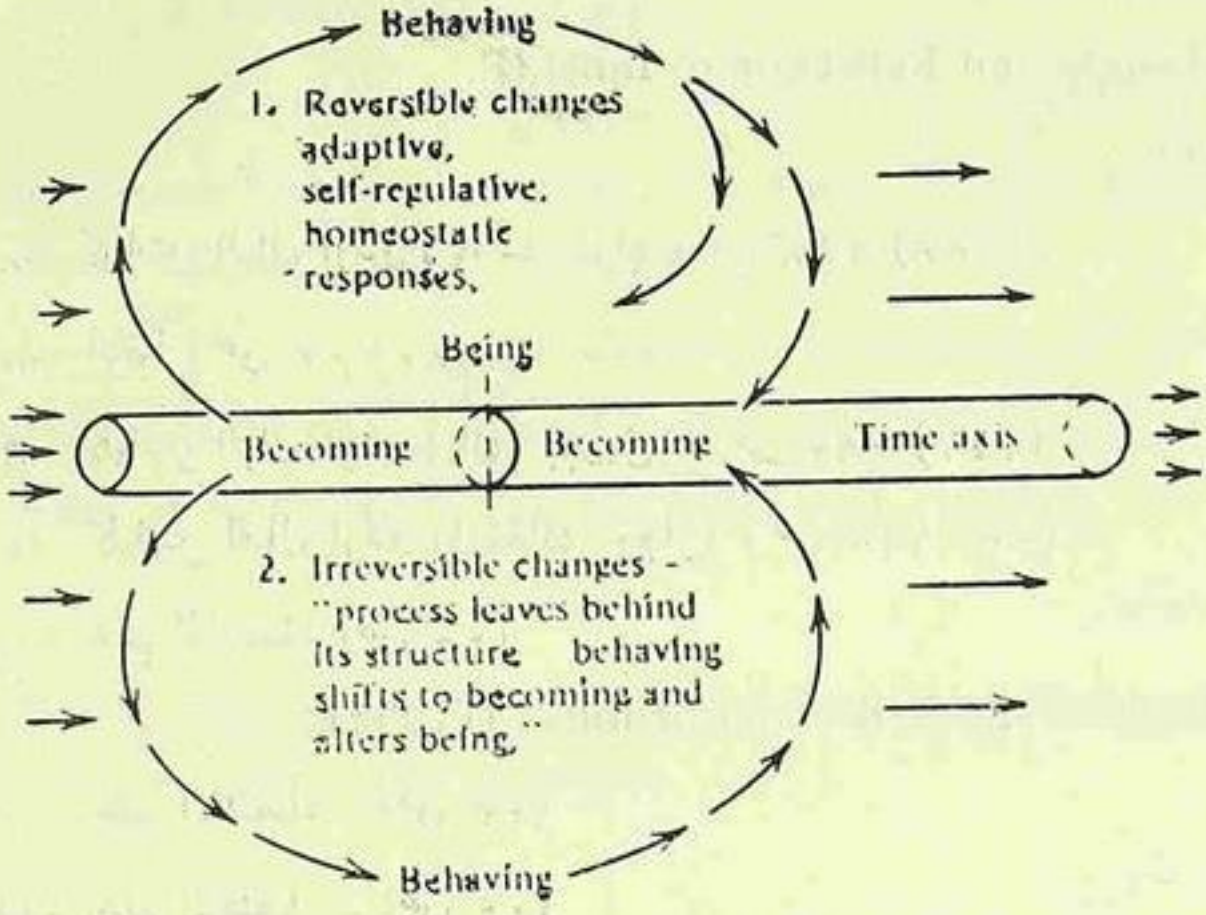

24. Agriculture and Home Economics Manual, USDA Publication

۲۵- قرآن حکیم سورہ بنی اسرائیل ، آیت ۸۴ -

26. Reconstruction of Religious Thought in Islam. (Pg. 103).

۲۷- کلیات اقبال اردو (بال جبریل) ، ص ۳۷۷ (۱۵) -

28. Thoughts and Reflections of Iqbal (P. 115).

۲۹- کلیات اقبال اردو (بال جبریل) ، ص ۳۹۷ (۱۰۵) -

۳۰- کلیات اقبال اردو (ارمغان حجاز) ، ص ۶۳۸ (۱۷۶) -

۳۱- کلیات اقبال اردو (ضرب کلیم) ، ۶۳۸ (۱۷۶) -

۳۲- کلیات اقبال (بال جبریل) ، ص ۳۳۴ (۱۳۲) -

33. Thoughts and Reflections of Iqbal (P. 114).

34. Reconstruction of Religious Thought in Islam. (P.)

۳۵- ایضاً -

۳۶- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۱۷ (۱۷) -

۳۷- ایضاً ، ۲۶۵ (۲۶۵) -

۳۸- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ۶۲۱ (۱۵۹) -

۳۹- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ص ۲۵۳ ، ۲۵۳ -

۴۰- کلیاتِ اقبال اردو (ضرب کلیم) ، ۶۲۹ (۱۶۷) -

۴۱- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ص ۴۸۵ (۱۸) -

۴۲- ایضاً ، ۶۰۶ (۱۴۴) -

۴۳- ایضاً ، ۵۶۲ (۱۰۰) -

۴۴- ایضاً ، ۴۷۹ (۱۷) -

۴۵- ایضاً ، ۵۴۷ (۸۵) -

۴۶- کلیاتِ اقبال (بال جبریل) ، ص ۴۴۲ (۱۵۰) -

۴۷- ایضاً ، ص ۴۲۰ - ۴۲۱ (۱۲۸ - ۱۲۹) -

۴۸- کلیاتِ اقبال اردو (ضربِ کلیم) ، ۵۵۰ (۸۸) -

۴۹- کلیاتِ اقبال اردو (بال جبریل) ، ۳۹۵ (۱۰۳) -

۵۰- کلیاتِ اقبال اردو (بانگِ درا) ، ۱۷۹ (۱۷۹) -

——:o:——

اشاریه

★ اشخاص

★ اماکن

★ کتب و رسائل

★ افکار و نظریات

اشخاص

الف

ابن تین ، محدث : ۵۹ -
ابن حزم ، امام : ۵۹ -
ابن خلدون : ۵۹ -
ابو امامہؓ : ۵۹ -
اقبال ، علامہ : ۱ ، ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۷ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۴ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۳ ، ۲۵ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۳ ، ۳۷ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۵ ، ۵۶ ، ۵۷ ، ۵۸ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ ، ۶۴ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۰ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۴ ، ۸۵ ، ۸۶ ، ۸۷ ، ۸۹ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۴ ، ۹۵ -
آوتھان : ۴۵ -
اوون : ۷۵ -
ایکن ، وائن : ۳۹ -
ایوب ، (صدر پاکستان) : ۳۱ -

ب

بخاری ، امام : ۵۹ -
برٹن : ۸۶ ، ۸۷ -
برگز : ۷ -
بلالؓ ، بن حارث المزنی : ۱۶ -
بولڈنگ ، کینتھ : ۳۶ ، ۷۳ -

پ

پیٹرسن ، این - ایف : ۲۷ -
پیرون : ۷ -

ٹ

ٹالسٹائی : ۷۴ -

ج

جارج ، ہنری : ۷۴ -
جاہنسٹن ، بروس - ایف : ۷۳ -
جیرارڈ ، رابنسن : ۸۶ -

جیفرسن (امریکی صدر) : ۲۸ ، ۷۲ ، ۷۶ ، ۷۷ -

ج

چنگیز : ۸۰ -

ح

حفظ الرحمٰن سیلوہاروی ، مولانا : ۵۹ -

ر

رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم : ۱۶ ، ۳۴ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۵۹ -
رینڈل ، جان برمن : ۷۲ -

س

سرخسی ، امام : ۵۹ -

ش

شاہ ، سید ذکی : ۲ -
شلٹز ، تھیوڈر : ۴۸ .
شیفتسبری ، لارڈ : ۷۴ -

ص

صدیقی ، نجات اللہ : ۱۷ -
صلاح الدین احمد اقبال ، مولانا : ۶۸ -

ع

عبدالرحیم ، خواجہ : ۱۹ -
عمرؓ ، حضرت : ۱۶ -

ف

فاروق ، برہان احمد ڈاکٹر : ۱۰ ، ۲۲ -
فشٹے : ۸۰ -
فورس ، ولبر : ۷۳ -

ق

قریشی ، منظور انور : ۲ -

ک

کاگاوا : ۷۷ -
کزنٹ : ۳۵ -
کلارکسن : ۷۴ -
کنفیوشس : ۷۳ -

گ

گرفن والبرٹ : ۴۰ -

ل

لوتھر ، مارٹن : ۷۳ -
لینڈز ، ڈیوڈ : ۷۳ -

م

محدث داؤدی : ۵۹ -
محمد ، امام : ۵۹ -
محمد تقی امینی ، مولوی : ۷۸ -
مسولینی : ۳۳ ، ۳۴ -
موشر : ۷۹ -

ی حسن ، سید : ۲ -
ازی ، سید نذیر : ۱۸ ، ۲۰ ،
۳۰ ، ۶۱ -

ن

ناشوما ، سوسیکی : ۴۹ -

و

وارڈ ، باربرا : ۲۹ -
ولی اللہ ۔ شاہ ، دہلوی (شاہ ولی اللہ)
۱۹ ، ۵۹ -
ویبر ، میکس : ۷۳ -
ویل ، سائمن : ۶۵ -

ہ

ہلاکو : ۸ -
ہیوں ، تھامس ۔ آر ایچ : ۷۳ -

——:o:——

اماکن

الف

ارجنٹائن : ۳۳ -
امریکہ : ۳۶ ، ۳۸ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۷۲ ، ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۸۶ ، جنوبی : ۳۳ ، شمالی : ۲۷ -
ایران : ۱ -

ب

بلغاریہ : ۷۴ -
بیونس آئرز : ۳۳ -

پ

پاکستان : ۳۱ ، ۳۳ ، ۳۶ ، ۴۳ ، ۴۵ ، مغربی پاکستان : ۴۳ -
پنجاب : ۱ ، ۲ ، ۶ ، ۹ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۶۰ ، ۷۱ -

ت

تھائی لینڈ : ۴۸ -

ج

جاپان : ۲۷ ، ۳۱ ، ۴۲ ، ۴۸ ، ۴۹ ، ۷۳ -

چ

چین : ۳۱ -

ر

روس : ۱۹ ، ۴۱ -

س

ساہیوال (منٹگمری ، نیلی بار) : ۶ -
سیالکوٹ : ۲۰ -

ک

کشمیر : ۴ -
کومیلا (بنگلہ دیش) : ۲۸ ، ۴۶ -
کینیڈا : ۷۴ -

ل

لاہور : ۲ -

م

مدینہ : ۲۶ ، ۳۴ ، ۴۷ ، ۷۵ -

مشی گن : ۴۰ -

ہ

ہند و پاکستان (برصغیر) : ۱ ، ۲۹ -

ہندوستان : ۲ ، ۷ ، ۴۵ ، ۵۷ -

ی

یوروپ : ۳۳ ، ۳۶ ، ۷۳ ، ۷۷ -

یوروپی ممالک : ۲۷ - آئرلینڈ : ۷۴ - ڈنمارک : ۴۱ ، ۴۲ - ناروے : ۴۳ - نیدرلینڈ : ۴۱ -

——:o:——

کتب و رسائل

الف

ارمغانِ حجاز : ۱ ، ۳ -
اسلام کا اقتصادی نظام : ۵۹ -
اسلام کا زرعی نظام : ۳۸ -
اسلام کا نظریہ ملکیت : ۱۷ -
اقبال کے حضور : ۱۸ -
انوار اقبال : ۱۹ -

پ

بال جبریل : ۶۴ -

ت

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ :
۱۰ ، ۵۵ -

ٹ

ٹائم (رسالہ) : ۴۰ -

ج

جاوید نامہ : ۴ ، ۱۹ -

خ

خفتگانِ خاک : ۳ -

د

دستور العمل برائے توسیع : ۸۶ -

ر

رموز بے خودی : ۵۷ -

س

سائنس اور سائنسی تعلیم کی نوعیت :
۸۶ -

ع

علم الاقتصاد : ۱ ، ۱۱ ، ۵۶ -

ق

قرآن (کتاب الھدیٰ) : ۱۰ ، ۱۱ ،
۱۳ ، ۱۶ ، ۲۱ ، ۲۳ ، ۲۵ ،
۲۶ ، ۳۰ ، ۶۴ ، ۷۴ ، ۹۱ -

م

مابعد الطبیعیاتی فلسفے کا ارتقا
۱ -
ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر :
۵۷ -

افکار و نظریات

الف

اداراتی تغیرات : ۴۹ ، ۵۲ -
اسلام : ۲ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۹ ، ۴۷ ، ۵۰ ، ۵۲ ، ۵۵ ، ۵۹ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ ، ۸۳ ، ۸۹ -
اصلاحات ، زرعی : ۶ ، ۱۸ ، ۳۱ ، ۷۱ -
اشتراک ، اشتراکیت : ۱۰ ، ۱۹ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۴۱ -
اقتصادیات : ۳۵ ، ۴۸ ، ۵۶ ، ۵۷ -
اقتصادی نظام ، ترقی : ۶۶ ، ۶۹ ، ۷۳ -
امانت ، زمین بطور : ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۹ ، ۲۵ ، ۳۱ ، ۷۸ -
امدادِ باہمی : ۴۷ ، ۵۷ ، ۷۱ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۷ -
انقلاب : ۵ ، ۱۴ ، ۴۵ ، ۶۲ ، ۷۲ ، ۸۱ ، ۸۲ ، ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵ -
انقلاب ، زرعی : ۷۲ -

ب

بنیادی انسانی حقوق : ۲۸ -

ت

تجدید ملکیت زمین : ۳۲ -
تحقیق و تفتیش ، تنظیم ، تعلیم ، زرعی : ۳۵ ، ۴۵ ، ۴۷ ، ۶۵ -
ترقیٔ دیہات : ۶ -
تنظیم نو ، زراعت : ۳۲ ، ۴۵ -
توحید : ۵۲ ۵۸ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۷ -
توسیع ، زرعی ، فلسفہ : ۳۵ ، ۷۲ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۱ ، ۸۶ ، ۹۵ -

ٹ

ٹیکس : ۷ -
ٹیکنالوجی : ۳۲ ، ۳۸ ، ۴۱ ،

۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۹ ، ۷۸ -

ج

جاگیر ، جاگیرداری : ۹ ، ۱۲ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۵۱ ، ۵۲ ، ۶۳ ، ۷۳ -

جدیدیت ، زراعت : ۳۷ ، ۴۶ ، ۴۹ -

جوہر اصلی ، زراعت بطور : ۷۳ -

ح

حد بندی ، زمینی : ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۲ ، ۳۶ ، ۴۶ ، ۴۹ ، ۵۲ -

حرکی تصور ، زمین : ۵۳ -

حق : استعمال ، انتفاع ، تمتع ، ملکیت : ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۸ ، ۲۰ ، ۴۸ ، ۵۱ -

حقوق اللہ ، العباد : ۱۲ ، ۱۸ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۳۱ ، ۴۱ ، ۷۳ -

خ

خودی : ۹ ، ۱۰ ، ۱۶ ، ۲۳ ، ۵۵ ، ۵۸ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ ، ۶۴ ، ۶۷ ، ۶۸ ، ۶۹ ، ۷۲ ، ۸۱ ، ۸۴ ، ۸۶ ، ۸۹ ، ۹۱ -

د

دین ، مذہب : ۲۱ ، ۳۰ ، ۵۵ ، ۵۹ ، ۶۷ ، ۷۵ ، ۸۸ -

دیہات ، زندگی و مسائل : ۲ ، ۶ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۹ ، ۵۹ ، ۷۵ ، ۷۶ ، ۸۱ -

دہقان : ۲ ، ۳ ، ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۳۳ ، ۵۰ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۴ ، ۶۸ ، ۸۵ -

ز

زراعت ، مسائل و افکار : ۱ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۵ ، ۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۵ ، ۴۶ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹ ، ۵۱ ، ۵۹ ، ۶۸ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۳ ، ۷۴ ، ۷۵ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۷۸ -

زرتشت ، مذہب : ۱ -

زمین : ۳ ، ۷ ، ۹ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۱ ، ۲۳ ، ۲۵ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۴ ، ۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۵ ، ۴۶ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۴۹ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۲ ، ۶۰ ، ۶۱ ، ۶۲ ، ۶۳ ، ۶۴ ، ۶۵ ، ۶۶ ، ۶۸ ، ۷۲ ، ۷۴ ، ۷۶ ، ۷۷ ، ۷۸ ، ۸۱ ، ۸۴ ، ۹۰ -

س

سائنس : ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۰ ، ۴۱ ،

۴۳ ، ۴۵ ، ۷۸ ، ۸۰ -
سرمایہ ، داری ، کاری : ۱۲ ،
۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۳۷ ، ۳۹ ،
۴۱ ، ۴۲ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۶ ،
۴۹ -

ش

شریعت ، احکام : ۲۱ -

ص

صنعت ، زراعت : ۳۴ ، ۳۵ ،
۳۶ ، ۳۷ ، ۳۸ ، ۴۵ -

ع

عرافت : ۴۷ -
عالت : ۴۷ -

غ

غربت : ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۹ ، ۱۱ ،
۳۳ ، ۳۶ ، ۴۴ ، ۴۹ ، ۵۲ ،
۷۸ ، ۸۲ ، ۸۳ ، ۸۴ -

ف

فارسنگ : ۲۸ ، ۳۶ ، ۴۶ -
فرائض ، حقوق : ۱۷ ، ۲۲ ، ۲۳ ،
۷۳ -
فکر : ۴ ، ۱۴ ، ۱۷ ، ۲۵ ، ۵۳ ،
۶۵ ، ۶۶ ، ۷۱ ، ۷۲ ، ۷۴ ،
۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۱ ، ۸۴ ،
۸۵ ، ۹۱ ، ۹۲ ، ۹۴ ، ۹۵ -
فلاح و بہبود ، قومی : ۷۲ -
فقہ ، اسلامی : ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۷ -
فنی معلومات : ۴۹ -

ق

قرآنی تصور ، زمین بطور متاع :
۲۵ ، ۴۶ ، ۷۲ ، ۷۴ -
قومیانہ ، زمین : ۱۰ ، ۱۴ ،
۱۸ ، ۱۹ ، ۴۱ ، ۵۰ -

ک

کاشت ، کاشتکاری : ۱۲ ، ۱۷ ،
۲۳ ، ۲۷ ، ۳۰ ، ۳۲ ، ۳۷ ،
۴۳ ، ۴۴ ، ۴۶ ، ۴۷ ، ۶۴ -
کوآپریٹو ، تحریک : ۴۶ ، ۷۷ -

ل

لادینی : ۲۰ -
لگان : ۶ ، ۷ ، ۹ ، ۱۱ ، ۱۴ -

م

مارکیٹنگ ، زرعی : ۳۵ -
مال ، ملکیت ، تصور ، حقوق ،
مسائل : ۹ ، ۱۱ ، ۱۲ ، ۱۳ ،
۱۴ ، ۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ ،
۱۹ ، ۲۱ ، ۲۳ ، ۲۵ ، ۲۶ ،
۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ،
۳۲ ، ۳۶ ، ۳۹ ، ۴۰ ، ۴۱ ،
۴۶ ، ۴۷ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ،
۵۲ ، ۷۳ ، ۷۴ -
متاع ، زمین بطور : ۲۵ ، ۲۶ ،
۲۸ ، ۲۹ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۶ ،
۴۶ ، ۴۷ ، ۵۰ ، ۵۱ ، ۵۲ ،

۵۳ ، ۷۲ ، ۷۴ ، ۷۸ ، وقف : ۱۹ -
محنت ، محنت کش ، مزدور، مزارع : ۴ ، ۵ ، ۶ ، ۹ ، ۱۲ ، ۱۳ ، ۱۵ ، ۲۰ ، ۳۳ ، ۳۷ ، ۴۲ ، ۴۵ ، ۶۳ ، ۶۵ ، ۶۶ ، ۶۹ -
معیشت ، نظام ، مسائل : ۴ ، ۱۰ ، ۱۱ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ ، ۲۹ ، ۴۵ ، ۴۹ ، ۶۸ ، ۷۱ ، ۷۳ ، ۸۱ ، ۸۴ -
مفاد عامہ : ۱۳ ، ۲۸ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۲ -
ملکیت ، تصور : ۲۸ ، ۳۶ ، ۴۹ ، ۵۱ ، ۵۲ -
منصوبے ، زرعی : ۴۷ -

ن

نظام ہائے ، سرمایہ داری : ۱۸ - مدنیت ، ۲۱ ، معیشت ، ۲۲ : جاگیرداری ، ۲۹ : ملکیت ، ۴۷ -

و

وطنیت ، نظریہ : ۲۸ ، ۲۹ -

——:o:——

تصحیح نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
x	۱۱	پنجاب	پاکستان
xiii	۱۳	کہ میں نے اپنی ملازمت	کہ میں نے اپنی ۳۲ سالہ ملازمت
xiv	۶	میں پائے جانے وسائل	میں پائے جانے والے وسائل
xv	۹	پیداور	مقدار
	۱۰	یہ قرض	حذف کر دیں
	۲۱	Wordless	Wordliness
xvi	۳	اش	اس
	۳	لیا گیا	لیا گیا ہے
	۳	اقبال	آپ
۴	۱۸	میں	حذف کر دیں
۷	۷	سرسر	سراسر
۹	۱۷	یا کہ	یا یہ کہ
۱۰	۲۰	طور	امور
	۲۲	چنانچہ	حذف کر دیں
	۲۲	اس	حذف کر دیں
۱۱	۶	جا سکتا	جا سکتا کہ :
۱۲	۲۵	"ملکیت کے بجائے متاع"	"ملکیت" کے بجائے "متاع"
۱۵	۲۲	خاکس	خاکش
۱۶	۱۵	کرتا	کرنا
	۱۷	جو تصور ملکیت	جو اسلامی تصور ملکیت
۱۷	۱	۱۴	حذف کریں
	۳	تھے	تھے[۱۴]

۱۸	۱۰	خوب خوب	خوب
۱۹	۸	اسلام نہیں"	اسلام نہیں
۲۲	۱۲	طلب حقوق	ایتائے حقوق
۲۷	۲۱	قعطات	قطعات
	۲۳	اس لئے	اور
۲۸	۱۹	پھوٹتے ہیں تصور	پھوٹتے ہیں اور تصور
۲۹	۱۴	بنتا تھا	بنا
	۲۲	تحت اسلامیہ	تحت ملتِ اسلامیہ
	۲۳	لگن	مگن
۳۰	۵	ناقص ہے"	ناقص ہے
	۶	ہم نے	"ہم نے
	۱۸	بجر	بجز
	۱۹	نہیں	نہیں"
۳۲	۲	زراعت کے شعور	زراعت کے سیاسی شعور
	۲۴	آ جاتی ہے دیہی علاقے	آ جاتی ہے اور دیہی علاقے
۳۴	۱۰	پر	میں
۳۵	۱۶	شہروں کا کام	شہروں میں کام
۳۶	۲۳	کے	سے
۳۸	۳	عمودی	عمودی بھی
	۱۳	ضروری ہوتا ہے	ضروری ہے
	۲۲	ڈرائیوار	ڈرائیور
۳۹	۲۶	تنہہ	تنہا
۴۰	۳	کو	کے لیے
	۲۰	۹۷	۱۹۷۸
۴۱	۷	نام پر زمین سے بیدخل	نام پر کاشتکار کو بیدخل
۴۲	۸	۱۹۶۰-۵۹	۱۹۵۰-۶۰
۴۳	۲۰	چاول مکئی	چاول اور مکئی
۴۴	۷	معمولی سے اخراجات	معمول کے اخراجات سے

		سو سوا سو زیادہ	سو سوا سو روپے زیادہ خرچ
	۸	جو استطاعت	جو یہ استطاعت
	۲۵	نے	حذف کر دیں
۴۷	۲۱	ملکیت	مملکت
۴۸	۱۲	ذرخیزی	زرخیزی
	۱۴	قول ہے	کا قول ہے
۴۹	۴	ذرخیزی	زرخیزی
۵۳	۳	بلکہ عصر کے	بلکہ عصر حاضر کے
۵۷	۶	کو	اور
		اور	کو
۵۸	۱۶	بازبانت	با زبانت
۶۴	۵	اور	(اور
	۷	بھی	بھی)
	۱۳	کرتا وہ	کرتا مگر وہ
۷۱	۶	محرکات کو ہی کافی مدد مل سکتی -	معاشی محرکات سے ہی مدد لی گئی
۷۴	۶	اقبل	اقبال
		ہمارے	اسلامی
۷۶	۱۶	پرآٹھوں	پر وہ آٹھوں
	۱۷	ہیت	کھیت
۷۷	۱۱	میں	سے
	۱۷	چنانچہ	حذف کر دیں
۷۸	۵	خلیفہ الارض	خلیفۃ الارض
۸۲	۵	کہتا ہے	کہتے ہیں
	۱۲	کہتا ہے	کہتے ہیں
۸۴	۲	دیتا ہے	دیتے ہیں
۸۷	۱۳	والے مقصد	والی مقصدی
	۱۴	کے وحدت کی وجہ سے	وحدت سے
	۱۵	کے خلا میں	کا خلاء میں
	۲۵	نیچے	اگلے صفحے پر